معلومات سلیقہ سے تحریر کی گئی ہیں، اس میں تذکرہ کی خوبیوں اور خامیوں کے علاوہ ارمان کا ادبی
و شاعری حیثیت سے درجہ بھی واضح کیا ہے، ارمان کا یہ تذکرہ بہت مختصر ہے، انھوں نے بعض
شاعروں کا صرف تخلص لکھ کر نمونۂ کلام دیدیا ہے، اور بعض کا حال چند فقروں اور جملوں میں لکھا ہے،
لیکن بعض کے کلام کے متعلق اپنی معتدل رائے بھی تحریر کی ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس
میں بنگال اور دوسرے علاقوں اور خاص طور پر بنگال کے ایسے شعرا کا ذکر ہے، جن سے
متداول تذکرے خالی ہیں، اس لئے اس کی اشاعت پر مرتب تحسین کے مستحق ہیں، امید ہے کہ
ان کی تلاش و محنت کی قدر کی جائے گی۔ (ض)

فارم ۷!

دیکھو رول نمبر ۸
معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	،، ،، ،،
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبدالرحمن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	،، ،، ،،

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں،
سید اقبال احمد

جلد ۱۲۵ ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ہجری سنہ کے چودہ سو برس ہو گئے، اس کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس طویل عرصہ میں مسلمانوں نے دنیا کے لوگوں کو کیا دیا، اور ان سے خود کیا لیا،

وہ ایک ایسی ملت ہو کہ جس کے متعلق قرآن حکیم نے کہا کہ اس کا کام توحید اور رسالت کے جلووں کا قائم کرنا، محتاج اور کس مپرس انسانوں کو اپنے مال کا شریک بنانا، سچائی اور راست بازی کا حکم دینا، ہر طرح کی برائیوں اور ظلم و فساد کو روکنا، خدا کی راہ میں جان و مال برباد کر کے انسانیت کے چہرے کو آب و رنگ دینا ہے، انھوں نے اپنے ہاتھوں میں تلواریں ضرور لیں، مگر یہ تلواریں سررشتۂ حیات کو کاٹنے کیلئے نہیں، بلکہ انسانی عظمت کی پاسبانی اور دنیاوی بہبود کی پشتیبانی کے لئے اٹھائی گئیں، اور اگر ذہن صاف ہو تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اسلام ابر کرم کا چھینٹا ہے، نسیم سحر کی موج حیات ہے، بوئے گل کا قافلہ ہے،

ہاتھوں میں تلوار لے کر اس بڑھنے والی قوم نے علم و فن کی بزم کس طرح سجائی، وہ انسانی تاریخ کے زریں کارنامے ہیں، انہی کی بدولت بغداد رشک ارم بن گیا، ایران کے مٹے ہوئے نقش و نگار ابھر آئے، قرطبہ اور غرناطہ علمی آرزوؤں اور تمدنی تمناؤں کے عشرت کدے اور گلکدے بن گئے، یونان کی برہم شدہ مجلس علم پھر گرم ہو گئی، صقلیہ کی اسلامی حکومت کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی، ہندوستان جنت نشان بن گیا،

یونان اور روم مر چکے تھے، یورپ میں ذہنی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، ایران میں فکری طوائف الملوکی تھی، ہندوستان جاگ کر پھر سو رہا تھا، تو بغداد منصور سے معتضد باللہ کے عہد تک بیت الحکمت بنکر علوم کے انوار سے منور ہو رہا تھا، گیلن، سقراط، افلاطون، ارسطو، اقلیدس، بطلیموس اور ہرقل کو عرب حکما نے اپنی زبان عربی میں جس طرح سمجھایا، اسی کے سہارے یورپ کے فلسفیوں نے ان کو جانا

یہ اور بات ہے کہ ان فلسفیوں نے اپنے ماہرانہ انداز میں ان کو اپنے رنگ میں ایسا رنگ لیا کہ عرب حکماء کی ساری موشگافیاں دب کر رہ گئیں،

بغداد کی طرح قرطبہ، غرناطہ اور قاہرہ بھی علمی مرکز بنے، اہل یورپ یہاں کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے، پوپ سلوسٹر ثانی نے اپنی تعلیم قرطبہ کی اسلامی درسگاہ میں پائی، مصر کے فاطمی حکمران کے زمانہ میں قاہرہ کی علمی شہرت سے بحر اوقیانوس اور بحر منجمد کے ممالک متاثر تھے، یورپ اس عہد میں بڑے مشکل دور سے گذر رہا تھا، کانسٹائن اور اس کے جانشینوں نے اپنی راسخ التقلیدگی میں تمام کتب خانوں میں قفل لگا رکھا تھا، علم کو جادو سمجھا جاتا تھا، اس کے حصول کو غداری قرار دیا جاتا تھا، فلسفہ اور سائنس در بدر کر دیے گئے تھے، اصلی عبادت کی ماں عدم واقفیت تھی، پوپ گریگوری اعظم نے روم میں سائنس کی تعلیم کی ممانعت کر دی تھی، آگسٹس نے جو عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا، وہ جلا دیا گیا تھا، یونان اور روم کے فلسفے نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، آزادی فکر پر ہر قسم کی پابندی تھی،

اسی زمانہ میں بغداد میں ایک ایسا مکتب فکر ابھرا، جو ہر چیز کی علت و معلول کی تفتیش میں لگا ہوا تھا، آج یورپ کو اپنے طریق استخراج و استنباط پر ناز ہے، لیکن اس کی ابتدا عرب حکماء ہی کی طرف سے ہوئی تھی ان علوم میں جن میں تجربے کے ذریعہ سے نتائج کی تصدیق ہو سکتی ہے، عرب بہت آگے بڑھ گئے، ابن رشد کو ارسطو کا شارح خیال کیا جاتا ہے، مگر بہت سے مسائل میں اس کی رائے ارسطو سے بہتر سمجھی گئی، اس کا فلسفہ پیرس و شمالی اٹلی کے تمام شہروں میں مقبول رہا، فرانسسکن فرقہ کے عیسائی تو اس کے پیرو ہو گئے تھے، ونیس کے طبقۂ اعلیٰ پر اس کا اثر اتنا بڑھا، کہ کلیسا نے اس کے عقائد کو قابل نفرین قرار دیا، بو علی سینا کو تو یورپ والے مشرق کا ارسطو تسلیم کرتے ہیں،

ابن ہیثم طبعیات کا بڑا ماہر تھا، اس کی کتاب المناظر کے ترجمے لاطینی اور اطالوی زبانوں میں ہوئے کیپلر نے

اس سے بڑا استفادہ کیا ہے، اس کی تصانیف کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے، جن سے یورپ نے پورا فائدہ اٹھایا، ابوموسیٰ جابر علم کیمیا کا موجد تھا، اسی کی تصانیف سے شورے کے تیزاب، ماء الملوک، نوسادر، چاندی کے شوری، زیبق سلیمانی، راسب الاحمر وغیرہ جیسی چیزیں یورپ والوں کو معلوم ہوئیں،

جبر و مقابلہ بھی عربوں کی خاص چیز رہی، وہی اس علم کے موجد ہیں، انھوں نے علم مثلث کے حسابات میں جیب اور قطر کے بجائے سماسہ کا استعمال کرنا سکھایا، اقلیدس میں جبر و مقابلہ سے کام لیا، مکعب مساوات کا حل کرنا بتایا، علم مثلث کروی میں مثلثات حل کرنے کی چند ایسی شکلیں بنا دیں جن سے یہ علم بالکل بدل گیا، یہ شکلیں اب تک مستعمل ہیں، جرمنی کے جان طرنے اس سے بڑا استفادہ کیا،

نجوم و ہیئت کے علوم میں ماشاء اللہ، احمد بن محمد نہاوندی، سند بن علی، یحییٰ ابن ابی منصور، خالد بن عبدالملک، ابو معشر، ابوالحسن انایریزی، محمد بن عیسیٰ، ابو عبداللہ جیسے فضلاء یورپ میں پیدا نہ ہوسکے، عربوں میں محمد ابن جبر البتانی کی وہی حیثیت تھی جو یونانیوں میں بطلیموس کی تھی، اس کی زیج کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا جس سے یورپ کے ہیئت داں صدیوں تک استفادہ کرتے رہے، ریاضیات میں اس کی بعض اصطلاحات ابھی تک وہاں مروج ہیں، چاند کی حرکت کا ماہر ابن باجور تھا جس کی فضیلت ہر جگہ تسلیم کی گئی، اس نے یہ معلوم کیا تھا کہ چاند کا فاصلہ آفتاب سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، جو بطلیموس کی رائے کے بالکل خلاف تھا، آل بویہ کے زمانہ میں عبدالرحمٰن صوفی نے ستاروں کی روشنی کے معلومات کے علم میں بڑا اضافہ کیا، خراسان میں ابوالوفا نے اختلاف حرکت قمر سے متعلق جو انکشافات کئے، ان سے چھ سو برس بعد ٹائیکو براہے نے پورا فائدہ اٹھایا، اور ابوالوفا کی ساری تحقیقات اس کی طرف منسوب کر دی گئیں، گھڑی کے پنڈولم کا موجد ابن یونس تھا، اس نے زیج الاکبر الحاکمی لکھی تو بطلیموس کے کارنامے ماند پڑ گئے، یہ یونان اور چین میں بہت مقبول ہوئی، ہیئت کی کتابوں میں اب بھی یہ درج کی جاتی ہے،

یورپ میں جو پہلی رصدگاہ بنی، اس کی تعمیر کرنے والا جابر بن غفیبہ تھا، عمر خیام اور عبدالرحمٰن الخزنی

نے مل کر جو زیج تیار کی وہ گریگوری کلینڈر سے چھ سو برس پہلے تھی، کیپلر جدید ہیئت کا بانی سمجھا جاتا ہے مگر اس سے ڈیڑھ سو برس پہلے الغ بیگ نے اس کی بنیاد ڈال دی تھی، سیاروں کے افلاک یعنی دوائر حرکت کا بیضاوی ہونا اور زمین کا آفتاب کے گرد حرکت کرنا ان دونوں مسئلوں کو عربوں نے کیپلر اور کاپرنیکس سے پہلے معلوم کر لیا تھا، الفانس دہم کی زیج الفنسیہ عربوں کی تحقیقات سے ماخوذ ہے، ابوالحسن مراکشی نے آلات رصد پر ایک کتاب ابتداء و انتہا لکھی جس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا، عربوں ہی نے اجرام سماوی کی حرکات کی زیج تیار کی، منطقۃ البروج اور اس کے زاویے کے بتدریج کم ہونے کی صحیح تحقیقات کی، چاند کے زیادہ سے زیادہ ارتفاع کا اختلاف دریافت کیا،

عرب جغرافیہ دانوں نے بطلیموس کی بہت سی غلطیاں نکال کر دکھائیں، ادریسی نے جغرافیہ کا علم یورپ میں پھیلایا، اس کی تصانیف کے ترجمے لاطینی زبان میں ہوئے، ابوالفداء سے پہلے ساٹھ جغرافیہ داں ایسے ہوئے جن کی جغرافیائی معلومات ہر گوشہ میں کارآمد سمجھی گئیں، البیرونی طول البلد اور عرض البلد معلوم کرنے میں بڑا ماہر تھا، مسلمانوں اور خصوصاً عربوں نے دنیا کے مختلف گوشوں میں سفر کئے، اور ایسی جگہوں کے سفرنامے لکھے جن سے یورپ بالکل واقف نہ تھا، وہ بحری سفر کے عادی رہے، اسلئے انھوں نے کمپاس کی بھی ایجاد کی تھی جس کا یورپ آج پورا فائدہ اٹھا رہا ہے، اسی کے ذریعہ سے مسلمان افریقہ، ہندوستان، ملایا اور چین تک پہنچے، پھر کولمبس سے پہلے امریکہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے، اور جب یورپ کو یقین تھا کہ زمین چپٹی ہے تو مسلمان جغرافیہ دان جغرافیہ میں درس گلوب کے ذریعہ سے دیتے تھے،

علم طب میں ابن زکریا رازی، علی ابن عباس، ابو علی سینا، ابوالقاسم خلف ابن عباس، ابو مروان ابن عبدالملک ابن زہر، البتاسس، ابو ولید، محمد ابن رشد، اور عبداللہ ابن علی بیطار کی طبی مہارت سے پورا یورپ حیرت زدہ رہا، الرازی کی اکثر تصانیف کے ترجمے لاطینی زبان میں ہوئے، اس کی کتابیں یورپ کی اکثر درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں، بو علی سینا کی تصانیف کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں

میں ہوئے، جن پر دس صدیوں تک طب کا دارومدار رہا، عربوں میں سب سے بڑا جراح قرطبہ کا ابوالقاسم تھا، جس نے بہت سے آلات جراحی ایجاد کئے، پندرہویں صدی عیسوی میں اس نے یورپ میں بڑی شہرت حاصل کی، جراحی کا دارومدار اسی کی تصانیف پر تھا، اشبیلیہ کے ابن زہر کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے جراحی، معالجات اور خواص الادویہ کو یکجا کر دیا، سمیات اور حمیات پر ابن رشد کی تصانیف یورپ میں برابر چھپتی رہیں، شفاخانوں کے قیام، حفظان صحت کے اصول، امراض کی تشخیص کے طریقے، اور قرابادین وغیرہ کے فن کو اہل یورپ نے عربوں سے بہت کچھ سیکھا، یونانیوں کی اناٹومی اور فارمیسی کے علوم کو عربوں نے بہت آگے بڑھایا،

عربوں نے علم نباتات میں جو ترقی کی وہ اس کے یوروپی ماہرین سے بہت آگے تھی، بعض علم الحیوانات کے ماہر ہے، اگر سات سو برس پہلے اس علم کی ابتدا، الدمیری نے کی، بوعلی سینا کی کتاب الاحجار میں پہاڑوں سے متعلق جو کچھ درج ہے، وہ علم طبقات الارض کا قیمتی ماخذ ہے، اس سے یورپ والے آج بھی فوائد حاصل کر رہے ہیں،

بارود بھی عربوں کی ایجاد ہے، چینیوں کے یہاں بارود کے ابتدائی اجزا آتش بازی میں استعمال ہوتے تھے، لیکن بارود کی قوت نفوذیہ کا استعمال عربوں ہی نے کیا، انھوں نے بندوق اور توپ کی ایجاد اسی سے کی، جو ساتویں صدی ہجری یعنی تیرھویں صدی عیسوی سے برابر استعمال کرتے رہے،

کاغذ کی بھی ایجاد عربوں ہی کی ہے، انھوں نے چیتھڑوں، سن، اور روئی سے، کاغذ تیار کرنے میں بے انتہا کمال حاصل کیا، انھوں نے اس کے بڑے کارخانے قائم کئے، اور آج دنیا کے سارے علوم و فنون کاغذ کے صفحات پر محفوظ کر دیئے گئے ہیں، کاغذ کی ایجاد ایسی بڑی خدمت ہے، جس سے ساری دنیا مسلمانوں کی مرہون منت ہے،

مسلمان اسپین پہونچے تو فراخ دل یوروپی مصنفین نے اعتراف کیا ہے، کہ انھوں نے اس کو علمی اور مالی ترقی کے لحاظ سے ایسا بدل دیا کہ یہ یورپ کا سرتاج بن گیا، انھوں نے عیسائیوں کو دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری برتنا، مفتوحوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا، اور قول پر قائم رہنا یورپ کے عیسائیوں کو سکھایا، نہروں کا جال بچھا کر وہاں کے بنجر علاقوں کو سرسبز اور شاداب باغات میں بدل دیا، پارچہ بافی کو ایسی ترقی دی کہ یورپ میں یہیں کے کپڑے مقبول تھے، شکر، روئی، لوہے اسبات اور کاغذ کے کارخانے کھول کر تجارت اتنی بڑھا دی کہ ان کے تجارتی بیڑے بحر اسود اور بحر قلزم سے افریقہ اور مڈغاسکر تک پہنچا کرتے تھے، اور جب یورپ میں تجارت پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی تو ابوالقاسم نے اس فن پر کئی رسالے لکھے،

یورپ کے عیسائی مسلمانوں کی عداوت میں دو صدی تک صلیبی جنگ لڑتے رہے، آخر میں صلاح الدین ایوبی سے شکست کھا گئے، مگر وہ ان لڑائیوں کے درمیان مسلمانوں کی شان و شوکت دیکھ کر ان سے مرعوب بھی ہوتے رہے، جس کے بعد بقول موسیو لیبان اسلحہ، لباس اور مکانات کے مشرقی تکلفات یورپ میں رائج ہوئے، ریشمی کپڑوں کا بننا، اور اُن کو عمدگی سے رنگنا جو مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ پر تھا، یورپ میں پھیل گیا، مشرق کی معماری اور صیقل گری سے بھی یورپ والوں نے استفادہ کیا، یورپ کا طرز عمارت بھی بدلنے لگا،

عقلیت پسندی بھی مغرب میں مسلمانوں کے ذریعہ سے پہنچی، کلیسا آزادی کا مخالف رہا، مگر ڈیکارٹ، ہابس اور لاک نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کی آواز بازگشت، ابن رشد اور ابن باجہ کے یہاں سُنی جا سکتی ہے، فارابی سے راجر بیکن اور البرٹس میگنس نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، بہادر شاہ کے خیالات چونکا دینے والے ہوتے ہیں، مگر اس کو اسلام کے روشن مستقبل پر یقین رہا، مورخین لکھتے ہیں کہ اگر عرب فرانس کی تسخیر کر لیتے یا قسطنطنیہ کو اپنی پہلی ہی کوشش میں سر کر لیتے تو یورپ کی تاریخ کچھ اور ہوتی، مگر اب بھی اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سلارنیو، بغداد، دمشق، قرطبہ، غرناطہ، ملاگا، اور صقلیہ سے جو روشنی پھیلی، اس سے یورپ کی نشاۃ الثانیہ میں بڑی مدد ملی،

مگر یہ بھی دیکھنا ہے کہ آج ہم کیا ہیں، جب یورپ نے کائنات کے عناصر اربعہ میں سے زمین، آگ،

پانی اور ہوا پر قابو حاصل کر لیا ہے، تو ہم کیا ہو کر رہ گئے ہیں، ہم یورپ سے متاثر ہو رہے ہیں یا ہم کو یورپ متاثر کر رہا ہے، پہلے ہم یورپ کو سب کچھ دیتے رہے مگر اب ہمارے ذہنی افلاس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ طامس کارلائل، بوسورتھ اسمتھ اور منٹگمری واٹ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ تعریف کر دیتے ہیں تو ہم آپ کی عظمت اور تقدس کے قائل اسی کے سہارے ہوتے ہیں، ہم اپنے اسلامی قوانین کو شاخت کی کتاب کے حوالے سے جاننا چاہتے ہیں، ہم اپنے سیاسی اور تمدنی کارناموں کی اہمیت کو لیبان، فان ہیمر اور ہٹی کے ذریعہ سے جاننے کی فکر میں رہتے ہیں، ہم اپنے نظام حکومت کو اسٹوارٹ، مل، ہابس، گرین، لاک، اور یہاں تک کہ کارل مارکس کے نقطہ نظر سے پرکھ کر اس کو اچھا اور برا قرار دیتے ہیں، ہم اپنے ادبی ورثہ کو نکلسن، براؤن، بروکلمن اور گارساں دتاسی کے ذریعہ سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے ذہن پر سگمنڈ فرائڈ اور کارل مارکس کچھ اس طرح چھا گئے ہیں کہ جیسے ہم کو اپنی وراثت میں کوئی نظری، فکری، عمرانی، اور نفسیاتی چیز ہی نہیں ملی، ہم یورپ کی ریس اور تقلید میں اپنے چہرے مہرے کو بنانے، ان کی وضع قطع لباس اور معاشرت اختیار کرنے حتی کہ بائیں ہاتھ روم کے آداب برتنے ہی میں اپنی تمدنی معراج سمجھتے ہیں، کیا اللہ کے آخری پیام کی نگہبانی، نبوت کی آخری ارمغانی اور ایشیا کی پاسبانی اسی یورپ زدگی سے ہو سکتی ہے،

ہم جدیدیت سے متاثر ہو کر جس ذہنی ارتداد اور فکری انارکی میں مبتلا ہو کر اپنی مذہبی اور روحانی قدروں پر تیشہ زنی کر رہے ہیں، اس کے خطرات کو محسوس کر کے اقبال بہت پہلے یہ تنبیہ کر گئے ہیں

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ — فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ — معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!

از خواب گراں خیز

مگر ان کی یہ آواز محض صدا بصحرا بن کر رہ گئی ہے،

مقالات

سیرت نبوی صلعم کی ایک اہم کتاب الشفا پر ایک نظر

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

شکوک و شبہات کا جواب کتاب الشفا کے وہ مباحث زیادہ اہم ہیں، جن میں شبہات و اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اس کی بعض مثالیں نقل کی جاتی ہیں، ایک جگہ معجزۂ شق القمر کے بارہ میں ایک شبہہ اور اعتراض کا ذکر کر کے اس کا یہ جواب دیا ہے،

"یہ اعتراض لائق التفات نہیں کہ اگر واقعی چاند کے ٹکڑے ہوئے ہوتے تو روئے زمین پر بسنے والے سارے لوگوں سے یہ بات مخفی نہ رہتی، کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ سارے لوگ اس رات میں آسمان کو دیکھتے رہے ہوں، اور اس کے بعد بھی انھوں نے چاند کا ٹکڑے ہونا نہیں دیکھا، اور اگر بالفرض یہ بات اتنے سارے لوگوں سے منقول ہوتی جن کا جھوٹ پر مجتمع ہونا محال ہے، تب بھی چاند کے ٹکڑے ہونے میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ چاند کا مدار ایک ہی نہیں ہے، وہ کہیں پہلے طلوع ہوتا ہے، اور کہیں بعد میں طلوع ہوتا ہے، کبھی ایک ملک میں چاند دکھائی دیتا ہے، اور دوسرے ملک میں نہیں دکھائی دیتا، بعض ملکوں میں پہاڑ اور بادل چاند کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں، اسی لئے بعض خطوں میں چاند گہن ہوتا ہے، اور بعض میں نہیں، اور بعض میں پورا گہن لگتا ہے، اور بعض میں

جزوی لگتا ہے، جن علاقوں میں چاند گہن نہیں لگتا وہاں کے عام لوگوں کو اسی روز دوسرے علاقے میں چاند گہن کا پتہ بھی نہیں چلتا، صرف ماہرین فلکیات کو اس کا علم ہوتا ہے،

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (یس) — یہ (خدائے) غالب وعلیم کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے،

اس حیثیت سے بھی غور کیجیے کہ اس معجزہ کا وقوع رات میں ہوا تھا، اور رات کے وقت لوگ گھروں کے دروازے بند کرکے آرام کرتے اور سوتے ہیں، اور دنیا کا سارا کاروبار بند رہتا ہے، ایسی صورت میں آسمان پر ہونے والی باتوں سے وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جو واقعی اس کی فکر وجستجو میں لگا ہوا ہو، یہی وجہ ہے کہ آسمان پر ہونے والے بہت سارے عجائب اور بعض بڑے بڑے ستاروں کے طلوع نیز چاند گرہن وغیرہ سے عام لوگ اس وقت تک بے خبر رہتے ہیں جب تک کہ ان کا مشاہدہ کرنے والے ان کو آگاہ اور مطلع نہیں کر دیتے ہیں (ج ۳ ص ۱۰۰)

ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"قرآن واحادیث اور اجماعِ امت سے یہ بات پوری طرح ثابت ومسلّم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاءؑ میں افضل وبرتر تھے، مگر ایسی صورت میں ان حدیثوں کے بارہ میں شبہ ہوتا ہے جن میں آپؐ نے اپنے کو دوسرے انبیاءؑ پر فضیلت دینے سے منع کیا ہے، چنانچہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ

ما ینبغی لعبد ان یقول — کسی شخص کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ
انا خیر من یونس بن متی — میں (محمدؐ) حضرت یونسؑ سے بہتر ہوں

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے کہا کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو تمام

لوگوں میں منتخب اور افضل قرار دیا ہے، اس پر انصار کے ایک شخص نے اسے تھپڑ مارا اور کہا کہ رسول اللہؐ کے ہوتے ہوئے تم اس طرح کی باتیں کر رہے ہو، مگر جب آپ کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا، لاتفضلوا بین الانبیاء (انبیاء کے درمیان ترجیح ومقابلہ نہ کرو) دوسری روایت میں ہے، لا تخیرونی علی موسیٰ (مجھے حضرت موسیٰؑ سے بہتر نہ قرار دو) حضرت ابوہریرہؓ ہی سے ایک روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جس نے یہ کہا کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں، اس نے غلط کہا" ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونسؑ سے بہتر ہوں ان سے یہ بھی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا یا خیر البریہ (اے تمام مخلوقات میں سب سے افضل) ارشاد ہوا کہ خیر البریہ (سب سے افضل) حضرت ابراہیمؑ تھے۔

اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اس سے اس وقت منع کیا تھا جب آپؐ کو اس کا علم نہ تھا کہ آپؐ اولادِ آدمؑ کے سردار ہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ آپؐ نے ازراہِ تواضع وانکسار اپنے کو دوسرے انبیاءؑ سے افضل قرار دینے سے منع کیا ہے، تیسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ آپؐ کی ممانعت کا تعلق اس امر سے ہے کہ انبیاءؑ کے درمیان اس طرح کی تفضیل سے بچنا چاہیئے، جو ان میں سے کسی کی تنقیص وتحقیر کا باعث ہو، حضرت یونسؑ کا آپؐ نے خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کہ قرآن مجید میں ان کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، اس سے ایک عام اور ناواقف شخص کے دل میں ان کے عظیم درجہ ومرتبہ کے بارہ میں نقص کا خیال گذر سکتا ہے، ایک اور جواب یہ ہے کہ ممانعت اس بنا پر کی گئی ہے کہ نفس نبوت ورسالت کے اعتبار سے تمام انبیاءؑ یکساں اور ایک ہی درجہ ومرتبہ پر فائز ہیں، اس لئے اس حیثیت سے ایک نبی کو دوسرے نبی پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت ان کے حالات، خصوصیات

کرامات، مراتب اور الطاف کی کمی زیادتی وغیرہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ نفسِ نبوت میں ان کے درمیان کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا سارا تعلق اُن چیزوں سے ہے جو نبوت کے علاوہ ہیں، اسی لئے رسولوں میں سے بعض کو صرف رسل کہا گیا ہے، اور بعض کو اولوالعزم من الرسل کہا گیا ہے، بعض کے متعلق فرمایا کہ ان کو مکان علی (بلند و بالا مرتبہ) عطا کیا، اور بعض کے بارہ میں کہا کہ ان کو بچپن ہی میں حکم سے سرفراز کیا، بعض کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو زبور دی، بعض کے لئے کہا کہ ان کو بینات دیئے، بعض نبیوں کے متعلق ہے کہ اللہ نے ان سے کلام کیا، اور بعض کے درجات بلند کئے، ارشاد ہے،

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّيْنَ عَلٰى بَعْضٍ (اسرا)	اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت بخشی۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بقرہ)	ان پیغمبروں میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اسی طرح بعض حدیثوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، کتاب الشفا میں ان کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر طوالت کے خوف سے اس کی مثالیں قلم انداز کی جاتی ہیں۔

مصنف کے نزدیک خالص دنیوی امور و معاملات میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی بات عمداً یا سہواً نہیں کہی ہے جو خلافِ واقعہ ہو، یہاں تک کہ غیظ و غضب، رنج و بیماری کی حالت اور مذاق کی صورت میں بھی آپؐ کی عصمت برقرار رہتی ہے، اس پر امت کے اسلاف کا اتفاق و اجماع ہے، اور حضرات صحابۂ کرام کا بھی یہ طریقہ تھا کہ وہ ہر حال میں آپؐ کی باتوں پر اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے، اور ان کی تعمیل میں عجلت کرتے تھے۔

مگر اس سلسلہ میں بعض اشکالات اور شبہات پیدا ہوتے ہیں، ہم صرف ایک اشکال کا ذکر کرتے ہیں، جو اس حدیث پر وارد ہوتا ہے جس میں آپ کے نماز کے اندر سہو کا ذکر ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز آپ نے عصر کی نماز ادا کی، اور دوسری رکعت کے بعد سلام پھیر دیا، یہ دیکھ کر ایک شخص ذوالیدین کھڑے ہوگئے، اور انھوں نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول کیا نماز میں تخفیف کردی گئی ہے، یا آپ سے نسیان ہوگیا ہے، ارشاد ہوا، ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی ہے، یعنی نہ تو نماز کی رکعتوں کی تعداد میں کمی کی گئی ہے، اور نہ مجھ سے بھول ہوئی ہے،

اس حدیث کے متعلق یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دونوں باتوں کی نفی کرنا خلافِ واقعہ امر تھا، کیونکہ قصر و نسیان دونوں میں سے ایک بات تو ضرور ہی ہوئی تھی اسی لئے حضرت ذوالیدینؓ نے آپؐ کے جواب کے بعد بھی یہ کہا تھا کہ ان میں سے کوئی بات تو ضرور ہوئی ہے،

مصنف اس شبہہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"علماء نے اس کے جواب میں متعدد باتیں کہی ہیں، ان میں بعض تو قرینِ صواب ہیں، لیکن بعض تکلف بارد معلوم ہوتی ہیں، جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے لئے اقوال میں وہم و غلط کو روا اور جائز قرار دیتے ہیں، جن کا تعلق وحی و بلاغ سے نہیں ہے، انکے نزدیک آپؐ کی ان دونوں باتوں پر سرے سے کوئی اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ ان دونوں چیزوں کا آپؐ کے قول کے بجائے عمل سے تعلق ہے، البتہ جو لوگ افعال میں آپؐ سے سہو و نسیان کا وقوع ممنوع سمجھتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی صورتوں میں آپؐ کا نسیان قصداً ہوتا تھا، تاکہ لوگوں کو آپؐ کی سنت کا علم ہوجائے

اس جواب وسے آپؐ اپنی خبر میں سچے تھے، کیونکہ نہ تو آپؐ سے نسیان ہوا تھا اور نہ نماز میں تخفیف ہوئی تھی بلکہ آپؐنے ایسا قصداً کیا تھا، تاکہ اس طریقے سے آپؐ ان لوگوں کے لئے اپنی سنتِ مبارکہ کو واضح کردیں، جن کو ایسی صورتیں نماز میں پیش آجائیں۔

مگر یہ جواب متروک اور حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے،

البتہ جو لوگ اقوال میں آپؐ کے سہو کو ممتنع خیال کرتے ہیں، اور غیر اقوال میں وہ آپؐ کے سہو کے قائل ہیں، انھوں نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں، ایک جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اعتقاد وخیال کے مطابق بات کہی تھی، قصر اور نماز کی تخفیف سے آپؐ کا انکار ظاہراً وباطناً دونوں ہی اعتبار سے بالکل سچ اور درست تھا، البتہ نسیان سے آپؐ کا انکار آپؐ کے ظن واعتقاد کی بنا پر تھا، کیونکہ آپؐ کو اپنے ظن وگمان کے مطابق نسیان نہیں ہوا تھا، پس گو آپؐنے اپنے ظن واعتقاد کا لفظاً ذکر نہیں کیا مگر آپ کا مقصد یہی تھا، اور یہ بات بھی بالکل صحیح اور درست تھی،

دوسری صورت یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے بارہ میں نسیان کی جو نفی کی ہے، اس کا تعلق نماز کے سلام سے ہے، یعنی آپؐ کا مقصد یہ بتانا تھا کہ میں نے سلام تو قصداً کیا ہے، البتہ نماز کی رکعتوں کی تعداد کے بارہ میں مجھے ضرور سہو ہوگیا ہے، اس تاویل کا احتمال ہوسکتا ہے، مگر یہ بھی بعید از حقیقت ہے، تیسری صورت اس سے بھی زیادہ بعید از حقیقت ہے، گو لفظاً اس کا بھی احتمال ہے، یعنی آپؐنے جو نفی کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ بیک وقت یہ دونوں باتیں نہیں ہوئیں، بلکہ ان میں سے ایک بات ہوئی، لیکن یہ بات لفظوں کے ظاہر کے خلاف ہے، کیونکہ بعض روایتوں میں آپؐ سے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں،

ماقصرت الصلوٰۃ وما نسیتُ ــــ نہ نماز میں کمی ہوئی ہے، اور نہ میں بھولا ہوں،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے دونوں باتوں کی نہایت وضاحت کے ساتھ نفی کی ہے، یہ تو ائمۂ فن کے اقوال تھے، جن میں سے ہر ایک کا احتمال ہے، گو بعض اقوال اصل واقعہ سے بالکل ہی بعید معلوم ہوتے ہیں، میرے نزدیک اقرب الی الصواب یہ صورت ہے کہ آپؐ کا اپنی ذات سے انکار، دراصل "لم انس" صیغۂ متکلم سے متعلق ہے، یعنی آپؐ اپنے بارہ میں اس کی تردید فرمارہے ہیں کہ "میں بھولا ہوں" دوسروں کے لئے بھی آپؐنے اس لفظ کی نفی کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے، "تم میں سے کسی کا یہ کہنا بہت خراب ہے کہ نسیت اٰیۃ کذا یعنی میں فلاں آیت بھول گیا" بلکہ اس کو نُسّیَ کہنا چاہیئے تھا، یعنی مجہول کا صیغہ لانا چاہیئے تھا کہ اس کو بھلا دیا گیا، چنانچہ بعض روایات واحادیث میں ہے کہ لست اَنسیٰ ولٰکن اُنسّیٰ یعنی میں نہیں بھولتا بلکہ مجھے بھلا دیا گیا، پس جب آپؐ سے سوال کرنے والے نے کہا کہ کیا نماز میں کمی کردی گئی ہے، یا آپ کو نسیان ہوا ہے تو جس طرح آپؐ نے قصر کا انکار فرمایا اسی طرح نسیان کا بھی انکار کیا، اور آپؐ کا مقصد یہ بتانا تھا کہ اگر ایسا ہوا ہے تو آپ بھلا دیئے گئے، تاکہ اس کے بارہ میں دوسرا شخص استفسار کرے،

اس تقریر کا ماحصل یہ نکلا کہ آپؐ کو اس لئے بھلوا دیا گیا تھا کہ اس طرح سب لوگوں کو آپؐ کی سنت کا علم ہوجائے اور وہ جان لیں کہ سہو کی صورت میں کیا احکام ہیں،

ایک اور جواب بعض صوفیہ اور مشائخ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سہو تو ہوتا تھا، مگر آپؐ سے نسیان نہیں ہوتا تھا، اس لئے آپؐنے نسیان کی نفی فرمائی، کیونکہ یہ غفلت اور آفت ہے، اور سہو آدمی کے خیال کا ایک شغل ہے، یہی وجہ ہے کہ آپؐ سے نماز میں سہو ہوجاتا تھا، مگر آپؐ اس کی جانب سے غافل نہیں ہوتے تھے، اس صورت میں آپؐ کے ارشاد میں کوئی چیز خلافِ واقعہ نہیں ہے بعض لوگوں نے نسیان کے معنی ترک لئے ہیں، جو نسیان ہی کی ایک صورت ہے[1]

---

[1] کتاب الشفاء ج ۲ ص ۱۳۳ تا ۱۴۴،

معلومات کی کثرت کتاب الشفا کے متنوع مباحث کے ضمن میں مختلف النوع معلومات بیان کئے گئے ہیں، ان سے مصنف کی وسعتِ علم و نظر اور گوناگوں چیزوں سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے ثبوت میں چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں،

۱۔ مصنف کو عربوں کے علوم و معارف، ان کی قدیم تاریخ، خاص خاص عادات و مالوفات اور اہلِ کتاب کے صحف و روایات سے پوری واقفیت تھی، اس سلسلہ کی متعدد بحثیں کتاب الشفا میں درج ہیں، مثلاً ایک جگہ وہ عربوں کے علوم و معارف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ یہ مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) انساب (۲) شعر (۳) گذشتہ خبروں خصوصاً جنگ کے واقعات کا علم[1]، دوسری جگہ لکھتے ہیں، عربوں کے تمام علوم و معارف چار چیزوں میں منحصر ہیں (۱) بلاغت (۲) شاعری (۳) کہانت (۴) اخبار و واقعات سے واقفیت[2]، ایک جگہ قرآن کی بلاغت کے ضمن میں عربوں کی بلاغت اور زبان دانی کا حال اس طرح لکھا ہے:۔

"اہلِ عرب زبان کے ماہر اور بلاغت میں یکتا تھے، حکمت ان کا خاص وصف و امتیاز تھا، اس میں اور زبان دانی میں کوئی قوم ان کے ہم پایہ نہ تھی، وہ حیرت انگیز قوت اور فصلِ خطاب کے مالک تھے، یہ ساری چیزیں خدا نے ان کی سرشت میں ڈال دی تھیں اس لئے نہایت برجستہ فصیح اور اچھوتا کلام ان کی زبان سے ادا ہوتا تھا، وہ مجلسوں اور اجتماعات میں فی البدیہہ تقریریں کرتے اور برجستہ اشعار کہتے اور پڑھتے، جس کی مدح کرتے اس کی شان نہایت اعلیٰ و ارفع ہوجاتی، وہ ممدوح سے اپنا مقصد و مدعا حاصل کرلیتے، اور جس کی مذمت کرنے پر آتے

---

[1] کتاب الشفا ج ۳ ص ۲، [2] ایضاً ص ۳۲۱ -

اس کو اپنے زورِ بیان اور بلاغتِ کلام سے نہایت ذلیل، حقیر اور گھٹیا ثابت کردیتے، ان کا کلام سچے معنوں میں سحرِ حلال تھا، اپنے انوکھے طرزِ ادا اور بلیغ کلام کے ذریعہ وہ اپنے ممدوح کو ایسا ہار پہنا دیتے جو موتیوں سے جڑے ہوئے ہار سے بھی زیادہ قیمتی اور خوب صورت معلوم ہوتا تھا، ان کی اس خوبی کو دیکھ کر عقل دنگ اور نگاہ ششدر رہ جاتی ہے، ان کی فصاحت و بلاغت سے مشکلات فوراً آسان اور حل ہوجاتی تھیں، اور دلوں کا بغض و کینہ دور ہوجاتا تھا، کھنڈروں اور مٹی ہوئی یادگاروں میں ہیجان پیدا ہوجاتا تھا، اور بزدل جری بن جاتا تھا، بند ہاتھ کشادہ ہوجاتے تھے، یعنی بخیل سخی ہوجاتا تھا، ناقص کامل بن جاتا تھا، اور مشہور گمنام ہوجاتا تھا، عرب کے بدویوں اور حضریوں دونوں کا کلام بہت بلیغ و موثر اور نہایت واضح ہوتا تھا، جو تیر کی طرح نشانے پر لگتا تھا، اور ٹھیک اقتضائے حال کے مطابق ہوتا تھا، بلاغت ان کی مطیع اور فرماں بردار لونڈی تھی، وہ اس کے سارے فنون پر حاوی تھے، نظم و نثر دونوں میں، ان کو غیر معمولی درک و مہارت تھی،" (کتاب الشفا ج ۱ ص ۱۱۵ تا ۱۱۶)

مصنف کو عربوں کی قدیم تاریخ و روایات اور ان کے اہم واقعات و حالات سے بھی بڑی واقفیت تھی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے دلائل بیان کرتے ہوئے بعثتِ نبوی سے پہلے کے متعدد عربوں کے واقعات اور ان کے متعدد اشعار کا ذکر کرتے ہیں، جیسے اوس بن حارثہ، کعب بن لوی، سفیان بن مجاشع، قس بن ساعدہ، سیف بن ذی یزن، زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل اور عثکلان حمیری وغیرہ۔

اسی طرح ان کو اہلِ کتاب کی روایات و واقعات، ان کی تاریخ، ان کے صحف و کتب کے متعلق بھی معلومات حاصل تھے ان کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں جو پیشین گوئیاں بیان ہوئی ہیں اور ان کے صحیفوں میں آپ کے جن ناموں کا ذکر ہے، ان کا تذکرہ کیا ہے، نیز اسرائیلیات اور

اسفارِ یہود کی غلط و واہی روایات کی تردید و تکذیب بھی کی ہے۔

یہی نہیں وہ قدیم زمانہ کے حکماء کے خیالات اور قدیم قوموں کے عادات و اطوار بھی کہیں کہیں بیان کرتے ہیں۔

۲۔ **ہندوستان اور اس کی قوموں اور اشیاء سے واقفیت** اس کتاب میں کئی جگہ ہندوستان، ہندوستانی اقوام و مذاہب اور یہاں کی بعض اشیاء وغیرہ کا ذکر آیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو ہندوستان کے بارہ میں بھی یک گونہ واقفیت تھی، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض امورِ غیب سے واقفیت کے ثبوت میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے:

انہ ذویت لہ الارض فاری	آپ کے لئے زمین سمیٹ دی گئی پس آپ کو
مشارقھا و مغاربھا وسیبلغ	اس کے مشارق و مغارب دکھائے گئے، اور
ملک امتہ ما ذوی لہ منھا	آپ کی امت کا ملک و اقتدار ان سب جگہوں تک پہونچ جائیگا جو آپ کے لئے سمیٹ دی گئی تھی'

اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:۔

مسلمانوں کی حکومت مشرق و مغرب میں سرزمینِ ہند اور مشرقِ اقصیٰ سے بحرِ طنجہ (مراکش) تک پھیل گئی، اس کی وسعت کا یہی حال شمال و جنوب میں بھی ہے، اور یہ اس امت کی ایسی خصوصیت ہے، جو دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں (الشفاء ج ۳ ص ۱۷۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طب و حکمت میں معرفت و واقفیت کے ذکر میں امام ترمذی کی جامع سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں عود ہندی کے متعلق آپؐ نے فرمایا ہے کہ اس کے اندر شفا کی سات چیزیں ہیں (ج ۱ ص ۱۶۱) ایک موقع پر امام بیہقی کی کتاب سے ایک روایت نقل کی ہے، اس میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے جنوں کے دیکھنے، ان کی باتیں سننے اور ان کو زط کے آدمیوں سے تشبیہ دینے کا ذکر ہے، زط

دراصل جاٹ کی تعریب ہے، جو ہندوستان کی ایک مشہور قوم کا نام ہے، بعض مورخین کے حوالہ سے انھوں نے ہندوستان کے ایک ایسے درخت کا ذکر کیا ہے، جس کی پتی پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا[1] (ج ۲ ص ۲۴۲)

اسی طرح انھوں نے تناسخ (آواگون) کو اہلِ ہند کا مذہب بتایا ہے، اور شمس و قمر، نجوم و کواکب اور آگ پوجنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ لوگ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں، یہاں کے برہمنوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ موحد ہونے کے باوجود نبوت کے منکر تھے، (ج ۴ ص ۴۳۵ تا ۴۴۰)

۳۔ **اسلامی فرقوں اور دوسرے مذاہب و ادیان سے واقفیت** مصنف کی وسعتِ علم و نظر اور کثرتِ معلومات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مختلف فقہی و اعتقادی فرقوں کے علاوہ دوسرے مذاہب و ملل اور ان کے مختلف فرقوں سے واقفیت رکھتے تھے، اور ان کے اصول و عقائد، طریقۂ استنباط اور طرزِ استدلال وغیرہ سے باخبر تھے، پہلے مسلمانوں کے اعتقادی مذاہب اور کلامی فرقوں کے ناموں کی فہرست ملاحظہ ہو:۔

اہلِ سنت و الجماعت، شیعہ، خوارج، اشاعرہ، متکلمین و فلاسفہ، معتزلہ، قدریہ، کرامیہ، نواصب اور مبتدعین وغیرہ۔

فرقۂ شیعہ کے مندرجہ ذیل گروہوں کے نام بھی بیان کئے ہیں:۔

روافض[2]، قرامطہ[3]، باطنیہ[4]، طیاریہ[5]، جناحیہ، بیانیہ[6]، غرابیہ[7]

---

[1] مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی وہ پٹن کے علاقہ میں ایک ایسے درخت کا ذکر کیا ہے، جس سے خزاں کے موسم میں ایک ایسا پتہ گرتا تھا، جس پر کلمہ لکھا ہوتا تھا، دیکھو العرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۹۴

[2] مصنف نے لکھا ہے کہ اس فرقہ کے بعض غالی لوگ ائمہ کو انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں [3] ان کو اسماعیلیہ بھی کہا جاتا ہے، یہ لوگ موسیٰ کاظم کے بعد اسماعیل بن جعفر صادق کو امام مانتے ہیں۔

ملحدین میں ان فرقوں اور طبقوں کا ذکر ہے۔

دہریہ، ثنویہ، دیصانیہ، مانویہ، مجوس، صابئین، یہود، نصاریٰ، مشرکین، حلول و تناسخ کے قائلین، معطلہ، فلاسفہ، منجمین، طبیعیین۔

منکرین رسالت میں ان فرقوں کا ذکر کیا ہے۔

براہمہ، اور عیسویہ، عنبریہ۔

مدعیان نبوت میں حسب ذیل فرقوں کے نام لئے ہیں۔

عیسویہ، جریریہ، کیسانیہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ٢٥٥ یہ بھی اسماعیلیہ ہی کی طرح کا فرقہ ہے، ان کے خیال میں قرآن اور علوم شرعیہ کا ایک ظاہری معنی و مفہوم ہوتا ہے، اور دوسرا باطنی جس کا علم صرف امام کو ہوتا ہے، ان لوگوں کے نزدیک فرائض سے وہ اشخاص مراد ہیں، جن کی ولایت و امارت کا حکم دیا گیا ہے، اور خبائث و محرمات سے وہ لوگ مراد ہیں، جن سے بری رہنے کا حکم دیا گیا ہو، یہ روافض کا ایک غالی فرقہ جو عبداللہ ابن معاویہ بن جعفر طیار کی طرف منسوب ہے، حضرت جعفر طیار رض کے دونوں ہاتھ اور وہ خود بھی غزوہ موتہ میں شہید ہو گئے تھے، رسول اللہ کو جب ان کے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ اللہ ان ہاتھوں کے بدلے ان کو جنت میں دو پر چڑیوں کی طرح عطا کرے گا، جن سے وہ اڑیں گے، اس فرقہ کے خیال میں اللہ کی روح انبیا میں حلول کرتی رہی ہے، اور آنحضرت کے بعد حضرت علی رض کے اندر، اور پھر ان کی اولاد کے اندر حلول کرتی رہی ہے، یہ فرقہ بیان بن سمعان تمیمی کی جانب منسوب ہے۔ اس کے نزدیک اللہ کی روح حضرت علی رض میں حلول کر گئی تھی، ان کے بعد ان کے بیٹے محمد بن حنفیہ اور ان کے بعد ان کے بیٹے ہاشم میں، اور پھر بیان میں حلول کر گئی، ان لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت جبریل خدا کی رسالت لے کر حضرت علی رض کے پاس بھیجے گئے تھے، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

وہ اور گروہوں کو بھی انھوں نے فرق ضالہ اور باطل مذاہب کے ضمن میں ذکر کیا ہے اباحیین اور غالی متصوفین۔

بقیہ حاشیہ ص ٢٥٥ سے اسی طرح مشابہ ہیں، جس طرح کوا کوے سے مشابہ ہوتا ہے، اس لئے حضرت جبریل کو اشتباہ ہو گیا۔

یہ لوگ خیر و شر الگ الگ دو معبودوں کے قائل ہیں، دیصان ایک مجوسی کا نام ہے جس کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، اس فرقہ کے نزدیک بھی خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خالق ہیں، مانی ایرانی بادشاہ شاپور بن اردشیر کے زمانہ میں ایک حکیم و فلسفی گذرا ہے، اس کے عقائد بھی ثنویہ اور دیصانیہ ہی کی طرح کے ہیں، یعنی آتش پرست، جو یزدان کو خیر کا، اور اہرمن کو شر کا خالق مانتے ہیں، صابی کے لفظی معنی اس شخص کے ہیں جو ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے، مگر اصطلاحاً ملائکہ اور کواکب کو پوجنے والے مراد ہیں، یہ نصاریٰ کے ایک فرقہ کا نام ہے، اس سے تمیم عنبر کے ایک شخص عبداللہ بن حسن عنبری کے متبعین مراد ہیں، یہ یہودیوں کا ایک فرقہ ہے جو عیسیٰ ابن اسحاق اصبہانی یہودی کی طرف منسوب ہے، اس شخص نے خود نبوت کا دعویٰ کیا، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اس کا خیال تھا کہ آپ صرف عربوں کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، ان لوگوں کے نزدیک نبوت و رسالت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا، یہ فرقہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ساری امت کی تکفیر کا قائل ہے، یہ امت کو اس لئے کافر سمجھتا ہے کہ اس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد حضرت علی رض کو پہلا خلیفہ نہیں بنایا اور حضرت علی رض اس لئے کافر ہیں کہ وہ پہلے خلیفہ نہیں بنے، اور انھوں نے حضرت ابوبکر رض سے اپنا حق طلب نہیں کیا،

یہ تو مسلمانوں کے اعتقادی مذاہب، کلامی فرقوں اور غیر اسلامی جماعتوں کا ذکر تھا، کتاب
الشفا میں فقہا، محدثین کے اجتہادی مذاہب و مسالک کا ذکر بھی ہے، اور اس سلسلہ
میں چاروں مشہور فقہی مذاہب کے علاوہ ان مجتہدین اور فقہائے امصار کے اقوال
بھی دئے گئے ہیں، جن کے مذاہب اب معدوم ہو چکے ہیں،

۴۔ مصنف کی وسعتِ نظر اور کثرتِ علم کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے
کتاب الشفا کی ترتیب و تالیف میں متعدد کتابوں سے استفادہ کیا تھا، اس سلسلہ میں
انھوں نے مختلف طبقوں کے جن مصنفین کے نام تحریر کئے ہیں، اگر ان کی فہرست نقل
کی جائے تو معارف کے کئی صفحوں میں آئے گی، اس میں مختلف طبقوں کے مشاہیر اور ائمہ
فن و کمال شامل ہیں، جیسے مفسرین و قراء، محدثین و شارحین حدیث، ائمہ رجال
اور جرح و تعدیل کے ماہرین، فقہا و اصولیین، اہل سیر و مورخین، علمائے انساب و

---

(۱) (حاشیہ صفحہ ۲۵۷) ۱ یعنی اباحیت پسند لوگ، جو حلال و حرام کی قید اور شریعت کی ذمہ داریوں
سے اپنے کو آزاد سمجھتے ہیں، ۲ مصنف صوفیہ اور مشائخ کی عظمت کے قائل ہیں، اور جا بجا
ان کے خیالات بھی نقل کئے ہیں، مگر یہاں جن صوفیوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے، ان کے
بارے میں تحریر فرماتے ہیں "یہ لوگ نبوت کا دعویٰ نہ کرنے کے باوجود کہتے ہیں کہ ان کی جانب
وحی کی جاتی ہے، اور وہ آسمان پر پہونچ کر جنت کی سیر کرتے ہیں، اس کے درختوں کا
پھل کھاتے ہیں، اور حوروں سے معانقہ کرتے ہیں، ان میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو اپنے
کو تکلیفاتِ شرعیہ سے بالاتر سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ محرمات کے ارتکاب اور شرائع کو
ترک کرنے پر اللہ ان سے مواخذہ نہیں کرے گا، کیونکہ عبادت، مجاہدہ اور ریاضت کی
کثرت کی وجہ سے ان سے فرائض ساقط ہو گئے ہیں، غالی صوفیوں کے سلسلہ میں انھوں نے

جغرافیہ، لغت و عربیت کے ائمہ، نحو و بلاغت اور معانی و بیان کے ماہرین اور مشائخ و صوفیہ شامل ہیں،

بعض مسامحات

انسان کا کوئی کام مسامحات اور خامیوں سے بالکل ہی خالی نہیں ہوتا، اس
کتاب کی خوبیوں اور خصوصیات کا مفصل ذکر کیا جا چکا ہے، ذیل میں اس کے بعض مسامحات کی
جانب اشارہ کیا جاتا ہے،

۱۔ مصنف نے کئی جگہ اس کی صراحت کی ہے کہ انھوں نے مشہور و معتبر حدیثیں نقل کرنے
کا اہتمام کیا ہے، مگر صحت کے اس دعوے کے باوجود ان کی کتاب میں ضعیف روایتیں بھی شامل
ہیں، بلکہ بعض موضوع حدیثیں بھی آ گئی ہیں، تفسیری روایات کے متعلق عام طور پر مشہور
ہے کہ وہ عموماً بے بنیاد ہوتی ہیں، خود مصنف نے بھی امام احمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تفسیر،
مغازی اور ملاحم کی احادیث و روایات کی کوئی اصل نہیں ہوتی، اس کے باوجود انھوں نے
بلا نقد و تبصرہ ضعیف تفسیری روایتیں نقل کر دی ہیں، اس کی متعدد مثالیں ہیں، ناظرین
اگر حروف مقطعات (کہیعص، طہ، یس، ق وغیرہ) اور بعض آیات مثلاً ولقد اخذ اللہ
النبیین میثاقہم ومنک الخ کے متعلق مصنف کی بحث ملاحظہ کریں تو اس کا اندازہ ہوگا۔

۲۔ بے اصل تفسیری اقوال بھی نقل کئے ہیں، اور کہیں کہیں مرجح اقوال کو نظر انداز
کر کے مرجوح اقوال بیان کئے ہیں، چنانچہ مندرجہ ذیل آیت:-

وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ (صافات) اور ان کے پیروؤں میں ابراہیم بھی،

کے متعلق لکھتے ہیں کہ ابو اللیث سمرقندی نے مشہور ماہر انساب محمد بن سائب کلبی کا یہ قول

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۷) حسین بن منصور حلاج کا بھی ذکر کیا ہے، گو وہ بظاہر شریعت کا پابند تھا، مگر اس زمانہ کے تمام فقہا
بغداد اور قاضی القضاۃ ابو عمر مالکی نے اس کے قتل اور پھانسی دیئے جانے کا فتویٰ اس وجہ
سے دیا تھا کہ اس نے انا الحق کہہ کر الوہیت کا دعویٰ کیا تھا۔

نقل کیا ہے کہ شیعہ میں ضمیر کا مرجع آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، اور شیعہ کے معنی منہج
اور دین کے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے
دین اور منہج پر تھے حالانکہ اس آیت کے سیاق و سباق میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)
کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ مفہوم قرآنی تصریحات کے بھی خلاف
ہے، کیونکہ قرآن نے آنحضرتؐ اور آپ کی امت کو ملت ابراہیمی کی پیروی کرنے کی دعوت
دی ہے، اس لئے ضمیر کا مرجع حضرت نوحؑ ہیں، جن کا زیر بحث آیت سے قبل
کی آیتوں میں ذکر ہوا ہے، اور شیعہ کے معنی دین و منہاج کے بجائے نسل و خاندان اور پیرو
ہیں، مگر اس صحیح قول کو مصنف نے قیل کہہ کر نقل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ
ان کے نزدیک یہ قول ضعیف و مرجوح ہے،

ایک اور ضعیف تفسیری قول ملاحظہ ہو، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے
اسرائیلی روایتوں پر اعتماد کر لیا ہے،

"حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کی جدائی اور مفارقت کی آزمائش اس لئے
جھیلنی پڑی کہ نماز میں بھی حضرت یعقوبؑ کی توجہ و التفات حضرت یوسفؑ کی جانب
مرکوز رہتی تھی، اور فرط محبت کی بنا پر وہ ان کو نماز کے وقت بھی اپنے پاس
سلائے رہتے تھے، ایک دوسرا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ دونوں باپ بیٹے ایک روز
اپنے گھر میں بھنا ہوا گوشت کھا رہے تھے، اور خوب ہنس رہے تھے، ان کے پڑوس
میں ایک یتیم بچے نے بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سونگھی تو اس کو بھی کھانے کی اشتہا
ہوئی اور وہ رونے لگا، اس کے رونے کی وجہ سے اس کی بوڑھی دادی بھی
رونے لگی، حضرت یعقوبؑ اور یتیم کے گھر کے درمیان دیوار حائل تھی، اس لئے حضرت یعقوبؑ

اور حضرت یوسفؑ کو یتیم کا کچھ علم نہ تھا، اس بنا پر حضرت یعقوبؑ کو اپنے عزیز ترین فرزند حضرت
یوسفؑ کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، اور وہ اتنا روئے کہ ان کی آنکھوں کی
سیاہی سفیدی میں تبدیل ہو گئی، اسی طرح حضرت یوسفؑ کو بھی شدید ابتلا سے دوچار ہونا
پڑا، جس کی حکایت قرآن مجید نے بیان کی ہے،

ایک اور ضعیف تفسیری قول ملاحظہ ہو:۔

"عبس و تولیٰ" کا فاعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یہ مشہور و مرجح بلکہ
تقریباً متفق علیہ قول ہے، اس میں اور اس کی بعد کی آیتوں میں اس لئے آپؐ پر عتاب کیا گیا ہے
کہ آپؐ کفار کے ایمان لانے کے زیادہ حریص رہتے تھے، اس لئے ان کو راہ راست پر
لانے کے لئے اتنے زیادہ فکرمند ہو جاتے تھے کہ مومنین کی تربیت کی جانب توجہ کم ہو جاتی تھی،
مومنین کی جانب سے اس عدم التفات اور کفار کی جانب شدت اعتنا کی بنا پر آپؐ کو
یہ تنبیہ کی گئی، مگر مصنف نے عتاب و تنبیہ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان کے
منافی خیال کر کے عبس و تولیٰ کا فاعل اس کافر کو بتایا ہے جس کی جانب غیر معمولی التفات
فرما کر آپ اعمیٰ (ابن ام مکتومؓ) کی جانب سے بے توجہ ہو گئے تھے، اور وہ جب آپؐ کی خدمت
میں حاضر ہوئے تو آپؐ کو آزردگی ہو گئی، لطف یہ ہے کہ ایسے مرجوح قول کو کسی مشہور و
معتبر مفسر کے بجائے صاحب حماسہ ابو تمام کے حوالہ سے نقل کیا ہے،

۳۔ مفسرین اور علمائے تاویل کا اتفاق ہے کہ مشہور و متواتر قراتوں کے مقابلہ میں
شاذ اور غیر معروف قرأت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، لیکن شفا میں کہیں کہیں شاذ اور غیر
معروف قراتوں کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، جیسے لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ
میں انفس کی مشہور و متواتر قرآت بضم الفا ہے، گو مصنف نے اس کا بھی ذکر کیا ہے،

گرشاذ قرأت بفتح الف کو بھی نقل کیا ہے، اور اس کی بھی توجیہ کی ہے، اسی طرح وَمَآ اُنزِلَ علی الملکین الخ میں ملکین میں لام مفتوح ہے، مگر مصنف نے دوسری شاذ قرأتیں بھی نقل کی ہیں،

۴۔ کہیں کہیں تکرار بھی ہے، جیسے عصمت انبیاء کی بحث میں حضرت داؤدؑ، یوسفؑ، یونسؑ، اور آدمؑ کے زلات کا مکرر ذکر ہے، اسی طرح بعض مباحث میں طول بیان سے بھی کام لیا ہے،

بعض امور و مسائل میں اہل علم سے بکثرت اقوال منقول ہیں، مصنف نے بلا ترجیح و محاکمہ سب اقوال تحریر کر دیئے ہیں، اس سے عام قاری کے لئے رطب و یابس میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، اور وہ اقوال کی کثرت و تعدد میں الجھ کر رہ جاتا ہے،

اس تحریر کا مقصد تمام خامیوں کی نشاندہی نہیں ہے، دراصل ان مسامحات اور فروگذاشتوں کے باوجود کتاب الشفا بہت مفید اور عظیم الشان کتاب ہے، اس کو لکھ کر مصنف نے اللہ کے رسول سے اپنے تعلق و محبت کا حق ادا کیا ہے، اللہ تعالےٰ تمام مسلمانوں کو رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ

کے

مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین کا مطالعہ

از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی صاحب

(۲)

روایت نمبر ۱ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس اللہ سرہ العزیز نے بیان فرمایا:

"ایک دفعہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ ہم دونوں دریا کی طرف مسافر تھے[1]، بھوک کے غلبے سے متاثر ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے، جنگل بیابان ہو کا مکان، دریا کا کنارا، خورد و نوش کا سامان کہاں، دم بھر بعد ہی ایک بکری نمودار ہوئی جو دو روٹیاں جو کی منھ میں لئے ہوئے تھی، آئی اور وہ روٹیاں ہمارے آگے رکھ کر چلی گئی، ہم نے کہا یہ بکری نہ تھی، مردان غیب میں سے کوئی تھا، ہم نے وہ روٹیاں اٹھالیں، اور کھالیں، اور کہا غیب سے ہمیں یہ ذوقہ ملا ہے"،

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بچھو اونٹ کا اونٹ بہت بڑا دریا کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے دریا کے کنارے پہنچتے ہی دریا میں اتر گیا، اور پار جانے لگا، ہمیں حیرت ہوئی، اور ہم نے

---

[1] مسافر بودیم ہم مسافر تھے، بودیم صیغہ جمع متکلم ہے، اس کو صیغہ واحد غائب بنانا علم صرف سے کمال کم آگاہی کی دلیل ہے،

کہ اس میں بھی کوئی بھید ہے، آؤ چلو دیکھیں، مگر دریا میں کشتی کہاں جو پار جاتے، ناچار بارگاہ ایزدی میں التجا کی: "الٰہ العالمین! اگر ہم نے اوصافِ درویشی کی تکمیل کر لی ہے، تو دریا ہمیں راستہ دیدے تاکہ ہم بھی دیکھ لیں کہ یہ بھید کیا ہے"

خدا کی قدرت دریا شق ہو گیا، خشکی نکل آئی، آگے آگے بچھو، پیچھے پیچھے ہم، دریا پار پہونچ گئے، وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص درخت کے نیچے سویا پڑا ہے، اُس کو ڈسنے کے لئے سانپ درخت سے اتر آیا ہے، سانپ بھی کیا ہے اژدھا کا اژدھا ہے، ہو گا کوئی ہزار من کا، بچھو سانپ کے پاس پہنچا، ڈنک مارا، اور غائب ہو گیا، سانپ مر کے ڈھیر ہو گیا، ہم سمجھے کہ یہ کوئی بزرگ بندۂ خدا ہے، جب ہی تو اللہ پاک نے یہ کرم فرمایا، اور اس کی جان بچائی ہے، یہ جاگے تو ہم اس سے ملیں، اس ارادے سے ہم اس کے پاس پہونچے، دیکھتے کیا ہیں، وہ تو شرابی ہے، شراب پیئے مدہوش پڑا سو رہا ہے، یہ دیکھ کر ہمیں حیرت بھی ہوئی، اور ندامت بھی ہوئی، ہم نے کہا کاش ہم نہ آئے ہوتے، اور یہ منظر نہ دیکھتے، ہم اسی پس وپیش میں تھے کہ ندائے غیبی سنائی دی،

اے ہمارے پیارو! اگر ہم نیکوں ہی کی رکھوالی کریں تو بدوں کی کون کرے گا،

جب وہ شرابی جاگا، اور مرے ہوئے سانپ کو اپنے پاس پڑے دیکھا، تو دہشت زدہ حیران رہ گیا، ہم نے سارا ماجرا اسے سنایا، وہ بہت شرمندہ ہوا، اور اس نے توبہ کی حتیٰ کہ وہ نکوکار بندگانِ خدا میں سے ہو گیا، کہتے ہیں کہ اس نے ننگے پیروں، اور پاپیادہ ستر حج کئے،

اختتام پر قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا۔

جب وقت آ جاتا ہے اور نسیم لطف وکرم چلنے لگتی ہے، تو ہزارہا مبتلائے فسق وفجور اور آلودۂ معصیت وگناہ کو توفیقِ توبہ نصیب ہوتی ہے، اور پھر نسیم لطف کا کرم انہیں میکدۂ تذلیل وتعیش سے اٹھاتی اور سجادہ نشینی کی بلند ترین اور باعظمت مسند پر لے جا بٹھا دیتی ہے، اور وہ بخش دیئے جاتے ہیں، اور جب کہیں قہر وغضب کی بادِ تند چلنے لگتی ہے، تو یہی ہوتا ہے کہ ہزارہا سجادہ نشینانِ مسندِ عظمت وکرامت کو اٹھاتی ہے اور میکدۂ تذلیل وتعیش کے قعرِ ذلت میں لے جا ڈالتی ہے (پناہ بخدا) (فوائد السالکین فارسی ص ۰۹)

یہ روایت تمام تر عجائباتِ قدرت کا مرقع ہے، اور عجب سبق آموز ہے صدیاں گزر گئیں، تاثیر کا یہ عالم ہے کہ آج بھی کوئی اہلِ دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، دل کی دنیا زیر وزبر ہو جاتی ہے اور خدائے قدوس کی قدرت کاملہ کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے،

اس میں حیرت وعبرت کا وہ سروسامان ہے، جو اُن عجائباتِ قدرت میں بھی نہیں ہے، جن کا ذکر عہدِ قدیم کے سفرناموں میں ہے، یہ روایت اوصافِ درویشی کی جامع اور ادب وانشا کا شاہکار ہے، اور کتنی سبق آموز ہے، وہ ندائے غیبی جو کہتی ہے کہ انسانیت کی دنیا میں مساوات ہے، اور انسان دوستی ہے، من وتو کا امتیاز یہاں نہیں چلتا، بندگانِ خدا نیک وبد سب اسی کے ہیں، لاچار ومغذور کوئی بھی ہو، امتیازِ نیک وبد سے دور رہ کے اس کی دستگیری کرنی چاہئے، یہی وہ نقطۂ عروج ہے جو اکابر صوفیہ کے اعمال وخدمات کا محور ہے، اونچ نیچ چھوت چھات اور نیک وبد کے امتیاز کا گزر کہاں؟ اسی امتیاز کو ذہن سے نکال پھینکنا تھا کہ کوئی بزرگ ہے جس کی شخصیت جاذبِ رحمت ہے، ذہن نشین کرانا یہ تھا کہ مقناطیسِ عصیاں بھی جاذبِ رحمت ہے، رحمت والا قادرِ مطلق ہے، اور بے چارہ گانِ عالم کا وہی دستگیر اور خبر گیرا ہے، اس کی قدرتِ کاملہ میں کسی کو دخل نہیں، لاریب وہ قادرِ مطلق اور وحدہٗ لاشریک ہے، یہی عین ایقان ہے یہی ذہنشین رہنا چاہیئے،

روزمرہ محاورہ میں مبالغہ کی آمیزش بھی ہوتی ہے، جو اُن کی تاثیر کو دوبالا کر دیتی ہے، اس وصف سے
کوئی زبان مستثنیٰ نہیں، سب ہی سمجھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے، اسے مبالغہ آمیز بیان سے تعبیر نہیں کیا جاتا، تشبیہ و
استعارہ سے مفہوم کی برمحل جو وضاحت ہوتی ہے، اور جو روشنی ملتی ہے، دفتر کے دفتر اس کے بالمقابل
بے مصرف رہتے ہیں، نثر۔ اسلوب کی سحر سامانی پناہ بخدا، "کژدم بقیاس شتر بزرگ اور مار بقیاس ہزار
مے بود" محاورہ نہیں تو اور کیا ہے، جنھوں نے وحوش و طیور کے عجائب گھروں کی سیر کی ہے، یا ان کتابوں
کا مطالعہ کیا ہے، جو عجائب المخلوقات کے موضوع پر ہیں، اور جو زباں داں ہیں اور اسلوب کی ہمہ گیری
اور کارفرمائی سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہیئت و جسامت کی ممیز حالت اور وزن کی فراوانی کے نمایاں
اظہار کے سوا اور کیا ہے،

فارسی داں طبقہ "ہچنیں گویند" کے صرفِ محل سے آگاہ اور واقف ہے، کہ یہ جزو جملہ شہرتِ عام
اور افواہ کا ترجمان ہے، اخبار مصدقہ کا مخبر نہیں، بات کا بتنگڑ بنا دینا، عوام کے مزاج کی خاصیت ہے،
سات کو ستر کہنے لگنا ان سے بعید نہیں ہے، اس سے انکار نہیں کہ اُن کی یہ روش اُن کی پسند و ناپسند کی آئینہ دار
بھی ہے، ہچنیں گویند کا بیان بتاتا ہے، کہ وہ شخص عوام میں مقبول ہو چکا تھا، عوام کہنے لگے تھے کہ اس نے
ستر حج کر لئے ہیں، نہ گنتی گن کر یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ واقعہ کا عدد وقوع کیا متعین ہوتا ہے، اور
نہ کسی افواہ پر یقین کیا جا سکتا ہے، جو عوام کی نفسیات سے آگاہ ہیں، اُن کے لئے یہ بیان محلِ اعتراض
نہیں،

اکابر صوفیہ کا اعتماد علی اللہ، سفر میں بے سر و سامانی اور رزاقِ مطلق کی رزاقیت کی شان
دعائے مستجاب کی تاثیر سالکانِ راہِ طریقت کے لئے مشعلِ راہ ہے، یہ روایت ہر اعتبار سے جامع
پُر تاثیر ادبِ صوفیہ میں بے نظیر ہے، ان ہی اوصاف سے متاثر ہو کر امیر خورد کرمانیؒ نے اسے
انتخاب کیا، اور سیر الاولیاء کے اوراق کو اس سے زینت بخشی ہے، جو ادبِ صوفیہ میں بے مثل اور نہایت

درجہ مستند مانی جاتی ہے، اس واقعہ سے جو اثر قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی
قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مبارک قلب پر ہوا ہے، آپنے نہایت موثر الفاظ میں اس روایت کے
آخر میں بیان فرمایا ہے، جو تمام تر قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کا اعتراف ہے، اور اس روایت کے موثر و
مستند ہونے کی دلیل ہے، آج بھی اس کا یہ اثر ہے، کہ پڑھنے والا پہروں اس کے اثر سے متاثر رہتا ہے
اور حجابات مرتفع ہونے لگتے ہیں،

روایت نمبر۲ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:

ایک مرتبہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ، ہم دونوں خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے،
ایک بزرگ تھے، انھیں بھی شیخ عثمانؒ کہتے تھے، جو بندگان خواجہ ابوبکر شبلیؒ میں سے تھے،
اور نہایت بزرگ تھے، ہم نے انھیں طواف میں دیکھا، اور ہم اُن کے پیچھے پیچھے اور قدم بہ
قدم چلنے لگے، وہ بزرگ روشن ضمیر تھے، وہ ہماری اس اتباع سے آگاہ ہو گئے، منھ
پیچھے کیا، اور فرمایا، ظاہری متابعت کیا کرتے ہو، وہ کرو جو میں کرتا ہوں، ہم دونوں
نے دریافت کیا کہ آپ کیا کرتے ہیں، فرمایا کہ میں روزانہ ہزار بار[۱] ختم قرآن کیا کرتا ہوں،
ہم دونوں اُن کی یہ بات سُن کر حیران ہو گئے، ہم نے سوچا ہر سورت کی ابتداء سے کچھ تلاوت
کر لیتے ہوں گے، یہ خیال ہمارے دل میں آیا ہی تھا کہ انھوں نے منھ اوپر کیا اور
با آواز بلند کہا کہ نہیں حرف حرف پڑھتا ہوں" (فوائد السالکین فارسی ص ۱۳)

ہر علم و فن کے عہد عروج میں کچھ ایسی شخصیتیں منصۂ شہود پر آتی ہیں، جن کے کارناموں سے
صدیوں اہلِ علم انگشت بدنداں رہتے ہیں، یہ روحانیت و تصوف کا عہد عروج تھا، جو گزر گیا،

---

[۱] من ہر روز ہزار قرآن ختم می کنم کا ترجمہ ہشت بہشت میں بیس ہزار اور ان بزرگوں کا نام برہان الدین لکھا
ہے، جو غلط ہے،

اور اپنی یاد چھوڑ گیا، نیک بندے اس کی یاد ہی سے ہدایت و رشد کی شمع روشن رکھتے ہیں، لیکن اُس قوم کے ذی علم افراد کے اذہان جو آمادۂ زوال ہوتی ہے یا ہو چکی ہوتی ہے، ایسے واقعات سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہوتے ہیں، وہ انھیں مبالغہ آرائی یا مبالغہ آمیزی سے تعبیر کرتے اور انکار کی راہ اختیار کرتے ہیں، ایسے اشخاص کا وجود قوم کے لئے فال نیک نہیں، بلکہ قوم کی پستی و ذلت کی علامت ہے۔

جب ہمارا ماضی تابناک تھا، تو ایسے محیر العقول واقعات سے انکار نہیں کیا جاتا تھا، کیونکہ اگر بعینہٖ وہ نہیں تو اُن جیسے متعدد واقعات سے فضا معمور تھی، ایک بزرگ تھے جو آغاز صبحِ صادق سے طلوعِ آفتاب تک قرآن پاک ختم فرما لیا کرتے تھے، (فوائد الفواد ص ۷) امیر خورد کرمانی نے لکھا ہے کہ خواجہ ابو یوسف چشتیؒ روزانہ پانچ قرآن پاک ختم کر لیا کرتے تھے، پھر دیگر امور کی طرف متوجہ ہوتے تھے، (سیر الاولیاء ص ۴۲)

فوائد السالکین کی اس روایت کو بالفاظ دیگر حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے بھی نقل فرمایا ہے، جو فوائد الفواد ص ۷ کی زینت ہے، فرق اتنا ہی ہے جتنا مختلف اشخاص کے بیان میں ہوتا، اور یہ کہ یہاں ختم قرآن کی تعداد سات سو بیان فرمائی ہے، ہزار بھی محیر العقول ہے، اور سات سو بھی، حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے اس روایت کو نہ تو مبالغہ آرائی سے تعبیر فرمایا، اور نہ چشتی بزرگوں کے عقائد و تعلیمات کے خلاف قرار دیا، بلکہ جب حاضرین مجلس میں سے آپکے مخلص مرید اعز الدین علی شاہ نے دریافت کیا کہ یہ شاید کرامت ہے تو آپ نے فرمایا:-

آرے کرامت باشد ہر معاملہ کہ بعقل	ہاں کرامت ہی ہے جو بات بعید از عقل ہوتی ہے
باز خوانداں دیگرست و آنچہ در عقل	وہ کچھ اور ہے، اور جو عقل میں نہ سمائے وہ
گنجائی نہ باشد آں کرامت باشد (فوائد الفواد ص ۷)	کرامت ہے،

مولانا علاء الدین کرمانیؒ بھی اس نقطۂ نظر سے متفق ہیں، ان کا ارشاد فوائد السالکین کی روایت کے ساتھ یہ ہے،

"جو بات سمجھ سے باہر ہے وہی کرامت ہے، وہ عقل میں سماتی نہیں ہے، یقیناً ان بزرگ کا ہزار قرآن مجید روزمرہ ختم کر لینا کرامت خاص ہے،

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز آبدیدہ ہوئے، اور فرمایا جسے جو کچھ ملا ہے حسن عمل کی بدولت ملا ہے، اور اگرچہ فضل ایزدی ہی سب کے شریک حال ہے، مگر جد و جہد لازم ہے، (فوائد السالکین فارسی ص ۱۳)

کیا حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے زیادہ راہ آشنا اور عالم و عارف آج ہے کوئی، جو اندازہ لگا سکے کہ یہ روایت بلاشبہ چشتی بزرگوں کے عقائد اور تعلیمات کے عین مطابق ہے، اور کلام کرنے کی گنجائش نہیں ہے،

اس روایت میں از بزرگانِ خواجہ ابوبکر شبلیؒ ہے، خواجہ ابوبکر شبلیؒ کا سنہ وفات ۳۳۴ھ بتایا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اُن کے اور قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز (متوفی ۶۳۳ھ) کے زمانے میں ڈھائی سو سال کا فصل ہے قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ایام حیات میں خواجہ ابوبکر شبلیؒ کے کسی غلام کا بقید حیات ہونا ممکن نہیں[1]، مگر یہ شبہہ لاحق ہو سکتا ہے، بندہ اور بندگان کی معنویت و حقیقت اور صرف و نحو سے ناواقف ہونے کی بنا پر، بندہ اسم مذکر ہے بستن مصدر سے، جس کے معنی ہیں کسی سے وابستہ ہونا متعلق ہونا، اور اس تعلق میں نہ قرب مزاحم ہے نہ بعد، وہ بھی بندہ ہے جو کسی کے عہد حیات میں اس سے وابستہ ہے، اور وہ بھی ہے جو مدت مدید کے بعد بلکہ بعد وفات وابستگی رکھتا ہے، خواجہ بزرگ

---

[1] انوار الفرید ص ۲۰ (مطبوعہ پاکستان)

خواجہ معین الدین سجزی قدس اللہ سرہ العزیز کا ارشاد ہے :-

"یکے از کمترین بندگانِ محمد رسول اللہ ام صلی اللہ علیہ وسلم (فوائد السالکین ص ۲۳)

عہد حاضر کے ایک فاضل اہلِ قلم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے حکیم سنائی کے متعلق لکھا ہے :-

"وہ دونوں اماموں کے بندے تھے، (ماہنامہ معارف اعظم گڈھ نومبر سنہ ۱۹۷۹ء ص ۳۲۳)

ڈاکٹر صاحب موصوف کی دونوں اماموں سے مراد امام اعظم ابو حنیفہ (متوفی سنہ ۱۵۰ھ) اور امام شافعیؒ (متوفی سنہ ۲۰۴ھ) ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ حکیم سنائیؒ (متوفی سنہ ۵۲۵ھ) کے ہمعصر نہیں تھے، تین تین سو سال سے زیادہ کا فصل ہے، مگر پھر بھی وہ دونوں ہی اماموں کے بندے تھے، اہلِ کمال کی روش یہی ہے، جو الفاظ کی سیرت و حقیقت سے آگاہ ہیں، وہ صرف محل سے ناواقف نہیں، لہذا اس واہمہ کی بنیاد کہ کسی کا صدیوں بعد از بندگان فلاں ہونا ممکن نہیں، عدم واقفیت کی علامت ہے، ہمعصر بھی از بندگان سے ہوسکتا ہے، اور صدیوں بعد بھی، اس روایت کو نہ تاریخ رد کرتی ہے، نہ چشتی بزرگوں کے مسلک کے خلاف ہے، البتہ علمی کم مائیگی سدِ راہ ہوسکتی ہے،

روایت نمبر ۳ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا :-

"میں اجمیر شریف میں خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر تھا، راجہ پتھورا زندہ تھا، اور وہ یہ کہا کرتا تھا کہ یہ درویش اگر یہاں سے چلا جائے، تو کیا ہی اچھا ہو، خواجہ بزرگؒ نے یہ بات سُنی، اس وقت کچھ اور درویش بھی حاضر خدمت تھے، اور حالتِ سُکر میں بیٹھے تھے، خواجہ بزرگ مراقب ہوئے، اور مراقبے ہی میں آپ نے فرمایا، پتھورا را زندہ مسلمانا دادیم (ہم نے

پتھورا کو زندہ ہی مسلمانوں کے حوالے کر دیا، کچھ دنوں بعد ہی سلطان شمس الدین محمد شاہ پہنچا اور اُس نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر لیا، شہر کو برباد کر ڈالا"

(فوائد السالکین فارسی ص ۱۵)

اجمیر کو سلطان محمد غوری نے ۵۸۸ھ ۱۱۹۲ء میں فتح کیا تھا، محمد غوری کا نام معز الدین محمد بن سام تھا، بعض تاریخوں میں شہاب الدین محمد غوری لکھا ہے اور بعض میں محمد شاہ غوری لکھا ہے، اس بیان میں شمس الدین کتابت کی غلطی ہے، اسمائی ایسی غلطیاں تاریخی کتابوں میں بھی ملتی ہیں، کاتب کے سہو سے نہ تو کسی روایت کو غیر مستند کہا جا سکتا ہے، اور نہ کسی کتاب کو جعلی قرار دیا جا سکتا ہے، فوائد السالکین جب کبھی صحت و مقابلہ سے مزین ہو کر شائع ہوگی تو سطحی غلطیاں رفع ہو جائیں گی، یہ روایت بذاتہ معتبر و مستند ہے، یہ روایت سیر الاولیا ص ۴۶ - ۴۷ میں بھی ہے،

روایت نمبر ۴ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا :-

"ایک دن خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز اور شیخ اوحد الدین کرمانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی اور دعاگو ایک جگہ بیٹھے تھے، اولیائے ماضی کا ذکر خیر ہو رہا تھا، سلطان شمس الدین انار اللہ برہانہ ہاتھ میں پیالہ لئے سامنے سے گزرا، سب نے اسے دیکھا، خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ جب تک یہ لڑکا دہلی کا بادشاہ نہ ہوگا، مرے گا نہیں"

(فوائد السالکین فارسی ص ۱۶)

خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی اس پیشین گوئی سے اولیاء اللہ کی بصیرت باطنی کی تائید ہوتی ہے، ایسے واقعات اکثر بزرگوں سے ظہور میں آتے رہتے ہیں،

اتباعِ شریعت وسُنت اور مجاہدات کی بدولت اولیاء اللہ ایسے اوصاف سے متصف ہوتے ہیں انکا کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے "امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے متعلق متعدد ایسے واقعات نقل کئے ہیں، (سیر الاولیاء ص ۱۴۱ - ۱۴۹)

رہی یہ بات کہ سلطان شمس الدین کے نام کے ساتھ انار اللہ ... تو اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں، اسے اصطلاح اموات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، غلط ہے، اعزازی کلمات کے وہ جگہ جو بزرگوں کے ناموں کے ساتھ لکھے ملتے ہیں اُن کا مُدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ان ہی کے ناموں کے ساتھ ہو سکتے ہیں، جو وفات پاچکے ہیں، بلکہ اُن کے ناموں کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں جو بقیدِ حیات ہیں، ان اعزازی کلمات کی اصل یہ آیۂ کریمہ ہے،

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ — راضی ہوا اللہ اُن سے اور وہ راضی ہوئے اللہ سے، ( )

یہ آیتِ کریمہ قرآن پاک میں کئی جگہ ہے، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ارشاد ہے کہ اس آیت کا نزول السابقونَ الاولون من المہاجرین والانصار سے متعلق ہے، جو بقیدِ حیات بھی تھے، شہید بھی ہو چکے تھے، اور وفات بھی پا چکے تھے، گویا کہ یہ مطلق ہے، وفات یافتہ حضرات کے ساتھ مقید نہیں ہے، یہی حال دیگر اعزازی کلمات کے جگوں کا ہے، خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ کا ارشاد ہے :-

"صلوٰۃ اللہ علیہ ورحمۃ اللہ علیہ وقدس سرہٗ ورضی اللہ عنہ ورضوان اللہ علیہم اگرچہ مختلف الفاظ ہیں، مگر ان کا مفہوم ایک ہی ہے، اور وہ ہے الصّلوٰۃ مِنَ اللّٰہ والرّحمۃ" (جوامع الکلم ملفوظ ۱۹ شعبان سنہ ۸۰۲ھ)

متقدمین نے بلا امتیاز ان اعزازی کلمات کو اُن کے لئے بھی استعمال کیا ہے، جو

بقیدِ حیات تھے، اور اُن کے لئے بھی جو وفات پاچکے تھے، وفات یافتہ حضرات کے ناموں کے ساتھ ان کا استعمال عام ہے، مگر فی زمانہ ان بزرگوں کے ناموں کے ساتھ کم استعمال ہے، یا بالکل نہیں ہے جو بقیدِ حیات ہیں، مگر عہدِ قدیم میں رواج تھا، اس نقطۂ نظر کی تائید میں صرف تین معتبر امثلہ پیش کرتا ہوں،

(۱) حضرت محبوب الٰہی کا ارشاد ہے کہ حضرت باباصاحب نے فرمایا کہ تو و بدرالدین اسحاق علیہ الرحمۃ برو ید" (فوائد الفواد ص ۵۹)

(۲) اجودھن (پاکپتن) کے قاضی ابوالفضل عبداللہ نے حضرت باباصاحبؒ کی حیاتِ طیبہ میں حضرت باباصاحب کا ذکر کیا تو کہا شیخ فریدالدین قدس اللہ سرہٗ العزیز (فوائد الفواد ص ۹۶)

(۳) حضرت باباصاحبؒ کے بزرگ خلیفہ علامۃ الوریٰ مولانا فخرالدین زرادیؒ نے حضرت والا کی حیاتِ مبارکہ ہی میں رسالہ اصول السماع تصنیف فرمایا تھا، حضرت کا نام نامی اس میں اس طرح لکھا ہے، کما قال شیخنا نظام الملۃ والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز، (رسالہ اصول السماع قلمی ص ۱۶)

یہ مسئلہ بھی صاف ہو گیا، غلط فہمی اور شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی، اب بے تکلف یہ تسلیم کیا جائیگا کہ یہ روایت اولیاء اللہ کے احوال کی اور اُن کی بصیرتِ باطنی کی آئینہ دار اور سبق آموز ہے،

روایت نمبر ۵ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا :-

"ایک دن میں اور قاضی حمیدالدین ناگوریؒ دونوں شیخ علی سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی خانقاہ میں تھے، محفل سماع تھی، گانے والوں نے جب یہ شعر گایا ۵

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جانے دیگر ست[1]

تو میں اور قاضی حمید الدین ناگوری اس شعر سے بہت ہی متکیف ہوئے،
لہذا تین رات دن اس شعر سے ہم متحیر و مدہوش رہے، پھر اپنے گھر چلے آئے اور
گانے والوں سے یہی شعر گواتے رہے، تین رات دن اور بھی لگاتار اس شعر سے متحیر
رہے کہ ہمیں اپنی بھی خبر نہ تھی، البتہ نماز بروقت پڑھ لیا کرتے تھے، اور پھر
سماع میں محو و مشغول ہو جاتے تھے، اس طرح سات شبانہ روز محو حیرت رہے، گانے
والے جب یہ شعر گاتے تو ایسی حالت وحیرت رونما ہوتی کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا،

(فوائد السالکین فارسی ص ۱۸)

اسی کے مماثل ایک روایت حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی بیان فرمائی ہے، جس میں قطب الاقطاب
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی وفات حسرت آیات کا ذکر ہے،
اور وہ یہ ہے:-

"حضرت محبوب الٰہی نے بیان فرمایا کہ شیخ علی سنجریؒ کی خانقاہ میں محفلِ سماع تھی،
اور شیخ الاسلام قطب العالم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز
اس محفلِ سماع میں شریک تھے، گانے والے نے جب یہ شعر گایا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

تو شیخ الاسلام قطب العالم حضرت خواجہ قطب الدین نور اللہ مرقدہ اس شعر سے بہت ہی
متکیف ہوئے، جب وہاں سے گھر آئے، تو متحیر و مدہوش تھے اور فرماتے تھے یہی گائے جاؤ،

---

[1] یہ کلام خواجہ احمد جام زندہ پیلؒ کا ہے، اس کا مطلع ہے:-

منزلِ عشق ازمکانے دیگر ست　　　مرد ایں رہ را نشانے دیگر است

گانے والے یہی شعر گاتے رہے، اور آپ اسی طرح متحیر و مدہوش رہے، البتہ نماز بروقت
پڑھ لیا کرتے تھے، پھر یہی شعر پڑھواتے عجب کیفیت ہوتی، چار شبانہ روز یہی کیفیت
رہی، پانچویں رات کو آپنے وصال فرمایا، (فوائد الفواد ص ۲۴۴)

یہ دو مختلف روایتیں ہیں، جو کیفیات کے اعتبار سے مماثل بھی ہیں، اور ان میں باہم مطابقت
بھی ہے، مگر یہ بدگمانی صحیح نہیں، کہ کسی نے عمل تحریف سے فوائد الفواد ہی کی روایت کو فوائد السالکین
میں شامل کر دیا ہے، کیونکہ یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے، یا تو علم مجلسی سے عدم واقفیت سے، یا
ذہن کے صلاحیتِ مطابقت سے عاری ہونے سے یا افتراپردازی کے جذبے کی بدولت، ورنہ
صورتِ حال روز مرہ کے حالات کے مطابق ہے،

جن صاحبوں کو مجالس سماع میں شریک ہوتے رہنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ جانتے ہیں کہ
ایک ہی جگہ کی مختلف مجالس میں بارہا ایک ہی غزل سننے میں آتی ہے، جو سامعین کے ذوق کے
مطابق اور پُرکیف ہوتی ہے، اس صورتِ حال کے پیش نظر یہ ماننا ہوگا کہ قطب الاقطاب حضرت
خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی مبارک طبیعت کو مذکورہ شعر سے خصوصی
مناسبت تھی، دو مجلسوں کا حال ہمارے علم میں ہے بعض اور مجالس میں بھی اس شعر پر ایسی ہی
کیفیت ہوئی ہوگی، لہذا یہ قرین قیاس ہے کہ جب خانقاہ شیخ علی سنجری کی مجلس میں پہلی بار یہ شعر
سنا تو سات شبانہ روز عالم تحیر میں رہے، اور متواتر سنتے رہے اور جب دوبارہ وہیں کی مجلس میں یہ شعر
سنا تو چار شبانہ روز عالم تحیر میں رہے، اور پانچویں شب کو واصل بحق ہوئے، اس روایت میں سبق آموز
نکتہ یہ ہے کہ یہ حضرات اس درجہ عامل بشریعت اور نماز کے پابند تھے، کہ عالم کیف و تحیر بھی عمل سے
مانع نہ ہوتا تھا، وقت آتے ہی طبیعت خود بخود نماز کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی، گویا کہ یہ وصف
عین طبیعت بن گیا تھا، اسی کی برکت سے تھا جو کچھ تھا آج اس کا تصور بھی مشکل ہے،

تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

عملِ شریعت سے بیگانگی کا یہ خمیازہ ہے، جو آج ہم بھگت رہے ہیں، آؤ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کی مبارک زندگی سے سبق لیں، اسلام کی قدروں کو اپنائیں، اور عاملِ شریعت بن جائیں، تاکہ ہماری زندگی بھی نورِ ایمان سے تابناک ہو جائے، اور بے عملی کی نحوست سے چھٹکارا پالیں، پھر تو سب ہی کچھ اپنا ہے،

کی محمد سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

دونوں روایتوں کا اپنا اپنا موقف ہے، اسی طرح انھیں سمجھنا چاہئے، جس طرح علم مجلسی کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے،

روایت نمبر۵ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:-

"یہ دعاگو خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر تھا، اور بھی درویش حاضرِ خدمت تھے، اولیاء اللہ کا ذکرِ خیر ہو رہا تھا، اتنے میں ایک شخص آیا، قدمبوس ہوا، اور خواجۂ بزرگ سے بیعت ہونے کے لئے درخواست کی، آپ نے اسے بٹھایا، اور فرمایا کہ جو میں کہوں وہ تم کروگے، تو میں تمہیں مرید کروں گا، اس نے کہا بے شک حکم کی تعمیل کروں گا، آپ نے فرمایا تم کلمہ اس طرح پڑھتے ہو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ایک بار اس طرح پڑھو، لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ، اس نے حکم کی تعمیل کی اور کلمہ اسی طرح پڑھ لیا جس طرح آپ نے بتایا تھا، خواجۂ بزرگ نے اسے بیعت کر لیا، اور نعمت و خلعت سے نوازا، اور فرمایا، میں نے تمہاری عقیدت کا امتحان لینے کے لئے اس طرح کلمہ پڑھوایا تھا، ورنہ کلمہ وہی ہے، جو تم پڑھتے ہو لا الٰہ

الا اللہ محمد رسول اللہ میں تو خود کمترین بندگان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک ہوں، "کے از کمترین بندگان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اور فرمایا کہ مرید کو اپنے پیر کی خدمت میں صادق اور راسخ العقیدہ ہی ہونا چاہئے،

(فوائد السالکین فارسی ص ۲۳)

یہ روایت بادی النظر میں عجیب سی لگتی ہے، اور ذہن فوری طور پر قبول کر لینے کو آمادہ نہیں ہوتا، مگر یہ روایت خواجہ ابوبکر شبلیؒ متوفی ۳۳۴ھ سے منسوب فوائد الفواد (ص ۲۳) اور سیر الاولیاء (ص ۳۳۸) جیسی نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل کتب تصوف میں ملتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا ہی واقعہ خواجۂ بزرگؒ کی خدمت میں پیش آیا ہو، اور انھوں نے خواجہ ابوبکر شبلیؒ کی اتباع میں یہ روش اختیار کی ہو، اور اس کی افتادِ طبع کے مطابق اصلاح کے لئے یہی مناسب ہو، ع کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر،

جن کا علم محدود ہے، وہ کچھ بھی کہیں، وہ قابلِ قبول نہیں، خواجہ ابوبکر شبلیؒ کو اب تک ہزار سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے، ان علماء نے جو علم وافر رکھتے ہیں، اور رموزِ تصوف سے آگاہ ہیں، اور لفظ رسول کے لغوی معنی سے اور اس کے صرف محل سے واقف ہیں، اور صرف محل سے متعلق اشمئزاز ان کے ذہن میں مستحضر ہیں، اس پر نہ تو کلام کیا ہے، اور نہ کرتے ہیں، یہ روایت دراصل اتباعِ شیخ کی ترجمان ہے، اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے،

روایت نمبر۶ | حضرت باباصاحب فریدالملۃ والدین مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز بیان فرماتے ہیں:-

"خانہ کعبہ کے مسافروں کا ذکر ہو رہا تھا، قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا، اللہ کے خاص بندے اپنے خانۂ خراب ہی

میں ہوتے ہیں، تو کعبۃ اللہ کو حکم ہوتا ہے، کہ اُن کے گرد طواف کرے، آپ یہ فرما رہے تھے، تو آپ اور حاضرین مجلس سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور عالم تحیر و شوق میں مستغرق ہو گئے، اور ایسے مستغرق ہوئے، کہ اپنی بھی خبر نہ رہی، دعا گو بھی عالم ذوق و شوق میں کھو گیا، پھر سب ہی اس طرح تکبیریں کہنے لگے، جس طرح طواف کے دوران کہتے ہیں، ہر ایک کے بدن سے تازہ تازہ خون بہنے لگا، جو قطرۂ خون زمین پر گرتا، نقش تکبیر بن جاتا، جب عالم ہوش میں آئے، تو خانہ کو اپنے روبرو دیکھا، ہم نے اس کا وہی ادب کیا، جو کیا جاتا ہے، چار بار اس کا طواف کیا، اور یہ ندائے غیبی سنی کہ اے عزیزو! ہم نے تمہارے حج کو تمہارے طواف کو اور تمہاری نماز کو قبول کیا، بلکہ ان کے بھی حج کو طواف کو اور نماز کو قبول کیا، جو تمہارے نقش قدم پر چلتے ہیں، اور چلیں گے،

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے پھر فرمایا، کہ شیخ الاسلام خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز ہر سال اجمیر سے زیارتِ خانہ کعبہ کو جایا کرتے تھے، جب ان کا کام کمالیت کو پہنچ گیا، تو جو حاجی حج کو جاتے، وہ بتاتے تھے، کہ ہم نے خواجۂ بزرگ کو طواف کرتے دیکھا تھا، حالانکہ وہ متمکن ہوتے تھے،

پھر فرمایا کہ خواجۂ بزرگؒ ہر شب کو خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے جاتے تھے، رات بھر وہیں رہتے، اور صبح ہونے سے پہلے ہی آجاتے تھے، اور اپنے جماعت خانہ میں نماز پڑھتے تھے،

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ حکایت خواجۂ بزرگ کی زبانی سنی ہے، اور انھوں نے حضرت شیخ عثمان ہراونی قدس اللہ سرہ العزیز سے سنی تھی، کہ جب حضرت

خواجہ قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو زیارت خانۂ کعبہ کا اشتیاق دامنگیر ہوتا تو فرشتوں کو حکم ہوتا کہ وہ خانۂ کعبہ کو چشت لے جائیں، اور خواجہ مودود چشتیؒ کے روبرو کر دیں، فرشتے حکم کی تعمیل کرتے، خواجہ موصوف اسے دیکھتے تو طواف کعبہ کرتے اور نماز پڑھتے، جب فارغ ہو جاتے تو وہ فرشتے اسے لیجاتے"

(فوائد السالکین فارسی ص ۲۵-۲۶)

یہ جملہ بیانات اوصاف مشاہدہ اور رموز طریقت کے جامع ہیں، تا وقتیکہ قلب و دماغ اعمالِ صالحہ کی صیقل سے متجلی نہ ہو گئے ہوں، اُن کے انعکاس کے متحمل نہیں ہو سکتے، یہ روحانیت کے اُن اعلیٰ و ارفع کیفیات کی لمعہ افگنی ہے کہ آلودۂ مادیت و معصیت اذہان اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتے، ایسی ہی تجلیات کی پرتو افگنی سے فوائد السالکین کا پایۂ اعتبار ادب صوفیہ میں بلند سے بلند تر ہے، ان میں سے بعض کا ذکر امیر خورد کرمانیؒ نے بھی کیا ہے، لکھتے ہیں :۔

خواجہ معین الدین الحق ...... می فرمود	خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدینؒ
مدتے گرد خانہ کعبہ طواف کردم فاما	.. .. .. فرماتے تھے، میں نے مدتوں
ایں زمان خانہ کعبہ گرد من طواف	خانہ کعبہ کا طواف کیا ہے، اب خانۂ
می کند، (سیر الاولیاء، ص ۴۶)	کعبہ میرے گرد طواف کرتا ہے،

امیر خورد کرمانیؒ نے وہ حکایت بھی نقل کی ہے، جو حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ سے متعلق فوائد السالکین میں ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہو کہ فوائد السالکین اس باب میں سیر الاولیاء کا ماخذ ہے، لکھتے ہیں،

ہر وقت کہ خواجہ مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ	جب بھی خواجہ مودود چشتیؒ کے
اشتیاق زیارت خانہ کعبہ غالب	خانۂ کعبہ کا اشتیاق ہوتا، اور بہت

شدے فرشتگان را حکم شدے	زیادہ ہوتا، تو فرشتوں کو حکم ہوتا
تا خانہ کعبہ را می آوردند در اطر	وہ خانہ کعبہ کو لے آتے، اور خواجہ
خواجہ مودود چشتی طواف کردے، و نماز	مودود چشتیؒ کے سامنے لاکر رکھتے تھے،
کہ آمدہ است بگزاردے، بعدہ	خواجہ موصوف طواف کرتے، اور
باز خانہ کعبہ را می بردند"	نماز پڑھتے، جو کعبہ میں پڑھی جاتی
(سیر الاولیا، ص ۴۲)	ہے، اس کے بعد وہ خانہ کعبہ کو لیجاتے'

امیر خورد کرمانیؒ کے بیانات کی روشنی میں کسی کو فوائد السالکین کے موثر بیانات سے انحراف کی گنجائش نہیں رہتی، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے متعلق یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے،:

عزیزے حکایت کرد کہ از قصبۂ	ایک عزیز نے بیان کیا کہ میں اپنے
خود بقصد زیارت سلطان المشائخ	قصبے سے حضرت محبوب الٰہیؒ سے نیاز
روان گردیدم گزر من میان قصبۂ	حاصل کرنے چلا تو جب قصبہ بوندی
بوندی افتاد، در دل گذشت کہ ایں	پہنچا تو مجھے یاد آیا، کہ یہاں بھی ایک
جا درویشے است کہ او را شیخ مومن	درویش ہیں، جن کا نام شیخ مومن ہے،
گویند با او ملاقات کنم بر در فتم پرسید	اُن سے بھی ملتا چلوں، جب اُن کی
کجا خواہی رفت گفتم بخدمت سلطان	خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے
المشائخ گفت، سلطان المشائخ را	دریافت کیا کہ تم کہاں جاؤ گے،
سلام من برسانی، و بگوئی کہ ہر شب	میں نے عرض کیا حضرت محبوب الٰہیؒ
جمعہ در کعبہ ملاقات می کنم چون من	کی خدمت میں حاضر ہوں گا، انھوں نے

بخدمت سلطان المشائخ پیوستم عرض	کہا، ان سے میرا سلام کہنا، اور کہنا
داشت کردم در قصبہ بوندی درویشے	کہ میں ہر شب جمعہ کو کعبہ میں آپ سے
است سلام رسانیدہ است و ایں	نیاز حاصل کرتا ہوں، جب میں حضرت
سخن گفتہ، شیخ متبسم شدہ فرمود	محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر
او درویشے عزیز است ولیکن زبان	ہوا، تو میں نے عرض کیا کہ قصبہ بوندی
خود بخود ندارد،	میں ایک درویش ہیں، انھوں نے سلام
(سیر الاولیا، ص ۱۴۵، ۱۴۶)	کہا ہے، اور یہ بھی کہا ہے شیخ رنجیدہ
	ہوئے اور فرمایا کہ درویش تو اچھا ہے
	مگر زبان قابو میں نہیں ہے،

اس بیان سے یہ واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ بھی خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی مثل زیارت خانۂ کعبہ سے مشرف ہوتے رہتے تھے، ایسے ہی واقعات اور بھی ہیں جن سے واضح ہے کہ سیر الاولیا، کا ماخذ فوائد السالکین ہے، فوائد السالکین کی روایات کو مبالغہ آمیز یا جعلی نہیں کہا جاسکتا، طیر و سیر اولیائے کاملین کا اختصاصی وصف ہے، اس کے باب میں مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے یہ کیفیت بیان فرمادیا ہے،

چون روح کامل می شود او را	جب روح کمال کو پہنچ جاتی ہے
قوت طیران حاصل می شود اچہ در	تو اسے پرواز کی قوت حاصل ہوجاتی
عالم علوی اچہ در عالم سفلی	ہے، خواہ عالم سفلی میں پرواز کرے
وجوارح نیز چون متابع قلب شدہ	خواہ عالم علوی میں، اعضا قلب کے

قلب متابع روح پس ہر جاکہ روح	تابع ہوتے ہیں، اور قلب روح کے
طیران نماید، قلب و جوارح طیران نماید	تابع ہوتا ہے، لہذا جہاں جہاں روح
(خیر المجالس ص ۶۲)	پرواز کرتی ہے تو قلب اور اعضا
	بھی وہیں پرواز کرتے ہیں،

یہ فوائد السالکین کی وہ روایتیں ہیں جنھیں کچھ نقادوں نے مبالغہ آمیز خلاف فطرت اور چشتی بزرگوں کے عقائد و تعلیمات کے خلاف بتا کر فوائد السالکین کو جعلی بتایا ہے، مگر تقابلی مطالعہ نے بتایا کہ یہ روایتیں اور ان کی مثل روایتیں فوائد الفواد، خیر المجالس اور سیر الاولیاء میں بھی ہیں جنھیں وہ نہایت درجہ معتبر و مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل مانتے ہیں، لہذا یہ روایتیں فوائد السالکین کے جعلی ہونے کا سبب قرار نہیں پاسکتیں، اور جو شبہات وارد کئے ہیں، وہ بھی تمام تر بے اصل ہیں، اور اگر بالفرض محال یہی روایتیں فوائد السالکین کے جعلی ہونے کا سبب ہیں، تو ان بے مثل اور نہایت درجہ مستند و معتبر کتابوں کے جعلی ہونے کا سبب کیوں نہیں ہیں جن کے اوراق کی زینت یہ روایتیں بھی ہیں،

اسلوب بیان حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز نے فوائد السالکین کے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ اسرار الٰہی اور انوار لامتناہی جو قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے بیان فرمائے، اور میں نے سنے، وہ میں نے اس مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین میں اپنی زبان میں لکھے ہیں، گویا کہ فوائد السالکین میں جو مضامین و خیالات ہیں وہ تو قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کے بیان فرمودہ ہیں، اور فوائد السالکین میں جو اسلوب بیان ہے، وہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسلوب بیان ہے،

فوائد السالکین کا اسلوب بیان سادہ سلیس، شستہ و رفتہ اور عام فہم ہے، بلکہ سنجیدگی اور متانت سے مالا مال ہے، سلوک و روحانیت کے عمیق و نازک خیالات کو ضبط تحریر میں لانا سہل نہیں ہے، بہت مشکل ہے، کیونکہ دقائق کا بیان گنجلک بھی ہو سکتا ہے اور تفصیلی طوالت سے بے لطف بھی ہو سکتا ہے، مگر حضرت بابا صاحبؒ نے کمال اختصار پردازی کی بدولت ہر کہیں اسے سنبھالے رکھا ہے، پھر ایسے نازک اور عمیق خیالات کو عام فہم زبان میں بیساختگی کے ساتھ بیان کرنا بھی کمال فن ہی سے متعلق ہے، جس سے ہر کس و ناکس عہدہ برآ نہیں ہو سکتا،

فارسی ایک وسیع اور نہایت وسیع ملک کی زبان ہے، مقامی اور طبقاتی امتیازات کی حامل بھی ہے، مگر فوائد السالکین کے اسلوب کا یہ اہم وصف ہے، کہ وہ ان امتیازات سے بالاتر ہے کوئی جملہ یا کوئی لفظ ایسا نہیں، جو عام فہم نہ ہو، اور ہر کہیں مروج نہ ہو، یا وہ طبقاتی و مقامی خصوصیت کا حامل ہو، جس کی فہمید میں کسی کو تکلف ہو سکے، ہر فارسی داں خواہ وہ کسی طبقے سے متعلق ہو، یا کسی مقام سے یکساں طور پر بآسانی سمجھ لیتا ہے، اور لطف اندوز ہوتا ہے، یہ زبان دانی کا ایسا وصف ہے، جو آپ اپنی مثال ہے، مگر تراجم سے استفادہ کرنے والے اس اہم وصف سے واقف نہیں ہو سکتے، اور تراجم سے اصل اسلوب پر تنقید و رائے زنی کرنا کمال کم آگاہی کی علامت ہے،

بیان میں کیف و جاذبیت اس قدر ہے کہ مطالعہ کرنے والا عالم سرور و کیف میں کھو جاتا ہے اور اسی عالم میں رہنا چاہتا ہے، قلب کی حالت عجیب ہوتی ہے، جو بیان نہیں کی جا سکتی ہے، دل میں اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اور دنیا سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے، یہ وصف آج بھی ہے جب ہمارا ماحول اور ہمارا معاشرہ روحانیت سے بیگانہ ہے، اور مادیت کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے، پھر بھی دل میں ہوک اٹھتی ہے، اور طلب پیدا ہوتی ہے، کہ ان بندشوں کو توڑ پھینکا جائے، اور اللہ کا ہو کر رہا جائے، اسی میں کامرانی ہے، اور اسی میں سکون قلب ہے، فوائد السالکین کا یہی وہ وصف ہے جس سے

مادہ پرست دہشت زدہ ہیں، اور بیجا بدرت تنقید بنانے کے درپے ہیں، محل تاسف ہے، کہ یہ نادرہ روزگار صحیفۂ روحانیت عقیدتمندوں کی بے اعتنائی کی بدولت گنج خمول کی زینت ہے، جو عقیدتمندی کے چہرے کا نہایت بدنما داغ ہے،

اسرار و انوار کی آمیزش نے اسلوب کی جاذبیت اور عظمت و اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے، فوائد السالکین اپنے اسلوب و مضامین کے اعتبار سے عظیم ادبی اور روحانی شاہکار ہے جس کی بدولت ہم اپنی عظمت رفتہ سے اور اپنے آبائی ورثے سے دوبارہ مستفید ہو سکتے ہیں یہ گراں قدر صحیفہ جو ہمارا روحانی ورثہ ہے، جس کی قدر و منزلت ہمارا اخلاقی فریضہ ہے، حضرت باباصاحبؒ کے اسلوب کی شائستگی زندۂ جاوید ہے، اہل کمال آج بھی اسے خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مجبور ہیں، اس سے زیادہ کسی اسلوب بیان کی خوبی اور کیا ہو سکتی ہے،

دل کی نگاہ فکر کی بینائی چاہیئے، جلوے ہیں عام ظرف تماشائی چاہیئے

نفس مضمون | فوائد السالکین کی یہ امتیازی خوبی ہے، کہ حال قال پر چھایا ہوا ہے، کیفیات کو گرفت میں لانا کارِ دارد ہے، خیالات اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں، اور نازک و عمیق بھی ہیں کسے [illegible] اور کسے نہیں، مرزا غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا، مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میری خام کاری اور کم مائگی کہیں مجھے رسوا نہ کر دے،

. حال توکلت علی اللہ خیالات کے بعض جگوں کو تبرکاً نذرِ ناظرین کرنے کی جسارت کرتا ہوں، اور مقبولیت کا تمنائی ہوتا ہوں،

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کا ارشاد ہے اور سالکین کے لئے ہدایت خاص ہے، اور وہ یہ ہے،:-

"شیخ میں قوت قلبی اس قدر ہونی چاہئے کہ جب کوئی بیعت کا طالب ہو تو وہ

بیک نظر اس کے قلب کو دنیاوی آلودگی سے پاک کر دے پھر اس کا ہاتھ پکڑے، خدا تک پہونچا دے"،

"یہی وہ وصف ہے جس سے صوفیائے کرام نے عہد ماضی میں کام لیا، اور جم غفیر کو راہ راست پر لگایا جس سے اللہ کی یاد کا ولولہ موجزن تھا،

"کم خوردن و کم خفتن اور کم گفتن، و کم آمیختن کی تلقین فرمائی ہے
دانشوران عالم آج بھی اس کے قائل ہیں کہ کم کھانے سے کم سونے سے اور کم بولنے سے اور کم آمیزی سے اطمینان قلب اور جودتِ طبع کی دولت نصیب ہوتی ہو ورنہ سکونِ قلب کی دولت کہاں دنیا میں فانی میں اس وصف سے متقدمین بھی بروئے کار آتی ہے،

"درویشی میں بہت راحت ہے، اور وہ پناہ گاہ ہے دنیا کی آفتوں سے محفوظ رہنے کیلئے"،

ہر خانوادہ سلوک میں درجات سلوک متعین ہیں، بعض مشائخ کے نزدیک پندرہ[15] درجے ہیں اور پانچواں درجہ کشف و کرامت کا درجہ ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ سلوک کے سو[100] درجے ہیں، سترہواں درجہ کشف و کرامت کا درجہ ہے، (فوائد الفواد ص، ۱۱۷) جب سالک اس مقام پر پہنچتا ہے تو کشف و کرامت کے وصف سے متصف ہو جاتا ہے تاہم سالکین راہ طریقت کو یہ ہدایت ہے تاوقتیکہ کہ کل درجات طے نہ کرلیں اظہار کرامت سے مجتنب رہیں، ارشاد فرمایا:-

جب کوئی مرتبۂ کرامت کو پہونچے تو اظہار کرامت سے مجتنب رہے، ورنہ دیگر مراتب سلوک طے نہ کر سکے گا، اور کشف و کرامت ہی میں الجھ کر رہ جائے گا البتہ جب پورے درجات طے کرلے بلکہ ان سے بھی سو درجے آگے نکل جائے، تو اظہار کرامت میں مضائقہ نہیں، مرد کامل وہی ہے جو تا وقتیکہ تمام مراتب طے نہ کرلے اظہار کرامت نہ کرے،

یہ بھی فرمایا:-

عالم تحیر میں پہنچ جانے کے بعد اظہارِ کرامت میں کچھ مضائقہ نہیں،

اس مقام پر فائز ہونے کے بعد کرامت کا ظہور بلا ارادہ بھی ہوتا ہے،

کشف چشم دید، حیرت انگیز و سبق آموز واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اس کے تاثرات کو قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے اعتراف کے اسلوب میں کچھ ایسے والہانہ انداز میں بیان فرمایا ہے کہ دل کی دنیا آج بھی زیر و زبر ہوئے بغیر نہیں رہتی، ارشاد ہے:

"جب وقت آ ہی جاتا ہے، اور نسیم لطف و کرم چلنے لگتی ہے تو ہزارہا مبتلائے فسق و فجور اور آلودۂ معصیت و گناہ کو توفیقِ توبہ نصیب ہوتی ہے، پھر نسیم لطف و کرم انھیں میکدۂ تذلیل و تعیش سے اٹھاتی ہے، اور سجادہ نشینی کی بلند و باعظمت مسند پر لے جا بٹھاتی ہے، اور وہ بخش دیئے جاتے ہیں، اور جب کبھی قہر و غضب کی باد تند چلنے لگتی ہے، تو پھر یہی ہوتا ہے کہ ہزارہا سجادہ نشینانِ مسندِ عظمت و کرامت کو اٹھاتی ہے اور میکدۂ تعیش و تذلیل کے قعرِ مذلت میں لیجا ڈالتی ہے، (پناہ بخدا)

ارشاد ہے:-

"اسرار الٰہی کا اظہار قربِ الٰہی میں مانع ہے، کامل الحال وہی ہے جو کسی حال میں بھی راز و نیاز اور اسرار الٰہی کا اظہار ہونے نہیں دیتا اسی لئے وہ گنجینۂ اسرار بنجاتا ہے"

اکثر لوگ کرامت اور اسرار الٰہی میں بین فرق ہے، جو امتیاز کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ کرامت کو بھی تصرفات کے حکم میں جانتے ہیں، اور یہ غلط ہے،

مردانِ خدا ایسے بھی ہیں جنھوں نے مدارجِ سلوک طے کر لئے ہیں، اور بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن کیا مجال جو اسرارِ الٰہی کی بھاپ بھی منہ سے نکل جائے، دراصل وہی گنجینۂ اسرار الٰہی ہیں،

حسنِ عمل کی ترغیب و تحریص کے باب میں ارشاد ہے،

فضلِ ایزدی تو بہرحال شاملِ حال، اور ہمہ وقت نازل ہے، تاہم جسے جو ملا جد و جہد اور حسنِ عمل کی برکت سے ملا ہے، اس لئے جد و کوشش لازم ہے، اس سے کسی حال میں غفلت مناسب نہیں،

ارشاد ہے:-

جس کسی نے راہِ محبت الٰہی اختیار کی، اور مصیبت و بلا سے گھبرایا جان لو کہ وہ محبِ صادق نہیں ہے،

بتانا مقصود یہ ہے کہ راہِ سلوک میں استقامت و استمالت مقدم و درکار ہے،

مرشد کی ارادت ہمیشہ بہا نعمت ہے، مرید کو لازم ہے کہ شیخ کی روش پر قائم و دائم رہے، اس سے سر مو انحراف نہ کرے،

میری یہ تمنا ہے کہ میری یہ کوشش بھی ارادتمندی کی اس صفت سے متصف رہے آمین

فرمایا:-

شیخ کی حیات میں جتنا ادب و احترام ملحوظ رہتا ہے اتنا ہی ان کی وفات کے بعد بھی ملحوظ رہنا چاہیے، اس لئے کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہی ہیں مگر ہم ان سے اوجھل نہیں ہیں، اس لئے ہمارا عمل وہی رہنا چاہئے تھا جو تھا،

فرمایا:-

نسبت کی تقویت کے لئے تجدید بیعت بیحد مفید ہے، اگر شیخ موجود نہ ہو یا انتقال ہو چکا ہو، تو اس کی کسی چیز سے تجدید بیعت کی جا سکتی ہے، فرمایا خواجہ ...... بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ اسی پر عمل پیرا تھے، اور میں بھی ہوں

حضرت باباصاحبؒ بھی اس پرعمل پیرا تھے، فرمایا:-

صحبتِ بد سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں، صحبتِ بد بلاسے بے درماں ہے، صحبت کا اثر لازم ہے، الصحبۃ تاثیر، صحبتِ بد سے بچے رہنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے،

مولانا رومؒ نے فرمایا ہے:- ؎

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صحبتِ صالح ترا صالح کند — صحبتِ طالح ترا طالح کند

ایسے ہی انمول موتی جابجا بکھرے ملتے ہیں،

ایسے ہی انمول موتی فوائد السالکین میں جابجا بکھرے ملتے ہیں، اگر دل زندہ پہلو میں ہے اور نگاہ پاک و باریک بیں ہے، تو فوائد السالکین صحیفۂ رشد و ہدایت ہے، اس کا ہر صفحہ مرقع ہے عجائباتِ قدرت کا، ہدایت اسی کو نصیب ہوتی ہے توفیقِ الٰہی جس کو سازگار ہوتی ہے واللہ یھدی من یشاء،

وقت کا تقاضا | وقت کا تقاضا یہ ہے کہ فوائد السالکین کو صحت و مقابلہ سے آراستہ کرکے شائع کیا جائے، یہ کام دیرطلب بھی ہے اور زرطلب بھی ہے، مگر ہے کرنے کے لائق، اگر اخلاص سے اور لگن سے کیا جائے گا، تو مشکلات بھی سدِراہ نہ رہیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ:

عہد حاضر میں فوائد السالکین کے فارسی مطبوعہ نسخے کمیاب ہیں: البتہ غلط تراجم دستیاب ہو جاتے ہیں، جو ہرگز قابل اعتناء نہیں، وقت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہند و پاک کی صوبائی زبانوں میں اس کے بہترین تراجم شائع کئے جائیں، ان ہی مقاصد کے پیش نظر میں نے ہندوستان کے مشہور کتب خانوں (لائبریریوں) سے فوائد السالکین کے قدیم قلمی نسخوں کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ پیش کرتا ہوں، ممکن ہے خدائے پاک کسی کو توفیق عنایت فرمائے، میرے لائق جو

خدمت ہوگی، اس سے مجھے اجتناب نہ ہوگا، انشاء اللہ

فوائد السالکین کے قدیم قلمی نسخے | (۱) خدابخش اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ میں دو نسخے ہیں، ایک سنہ ۱۰۹۷ھ کا مکتوبہ ہے، اور دوسرا بارہویں صدی ہجری کا ہے یعنی بارھویں کا،

(۲) اندھرا پردیش گورنمنٹ اورنٹیل میونسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد میں دو نسخے ہیں ایک سنہ ۱۰۹۶ھ کا مکتوبہ ہے، اور دوسرا ۱۲۳۰ھ کا،

(۳) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں ایک نسخہ ہے، جو سنہ ۱۲۰۰ھ کا مکتوبہ ہے،

(۴) سالارجنگ میوزیم حیدرآباد میں ایک نسخہ ہے، جو سنہ ۱۳۵۰ھ کا مکتوبہ ہے:

(۵) رضا لائبریری رامپور میں تین نسخے ہیں، جن میں سنہ کتابت نہیں ہے،

(۶) عربی فارسی انسٹی ٹیوٹ ٹونک (راجستان) میں ایک نسخہ ہے، جس میں سنہ کتابت نہیں ہے،

(۷) مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک نسخہ ہے، جس میں سنہ کتابت نہیں ہے،

(۸) دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں ایک نسخہ ہے، جس میں سنہ کتابت نہیں ہے،

اگر کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ ان سے بھی قدیم بعض نسخوں کا پتہ نشان مل جائے بعض قدیم قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی لاہور (پاکستان) میں بھی ہیں، ابھی مجھے ان کے متعلق مفصل معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہیں، میری یہ بھی درخواست ہے، کہ اگر کسی صاحب کے علم میں یا تحویل میں فوائد السالکین کا کوئی قلمی نسخہ ہے تو مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں میں ان کا شکر گزار ہوں گا،

...... ختم شد ......

کشمیر میں اسلام کی اشاعت

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سرینگر (کشمیر)

(۲)

محمود غزنوی کشمیر پر عربوں کے حملوں کا سلسلہ ۱۴۲ھ میں ختم ہوا، تو اس کی طرف وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کی آنکھیں اٹھیں، ان میں مشہور و ممتاز فاتح سلطان محمود غزنوی کا نام سرِ فہرست ہے،

سلطان محمود نے دو یا تین بار کشمیر میں قسمت آزمائی کی، کشمیر کی تاریخیں محمود کے حملوں سے متعلق صحیح معلومات بہم نہیں پہونچاتی ہیں، سنسکرت تواریخ تو معمولی اشاروں پر اکتفا کرتی ہیں، جبکہ فارسی تذکرے، جو کشمیری مصنفوں نے لکھے ہیں، مبالغہ آمیزی اور غلط واقعات سے پر ہیں، جس کی بنا پر وہ موضوعِ زیرِ بحث کے لئے ناقابلِ اعتماد ہیں،

مولوی غلام حسن مرحوم لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے بیجبارہ (متصل اسلام آباد) کے ایک مندر کے اسباب زر و طلائی ضبط کئے، بلکہ کشمیر کے راجہ سنگرام نے سلطان محمود کو تحائف پیش کئے، مورخ مذکور ملا احمد علامہ کے حوالہ سے لکھتا ہے،

سنگرام راجہ تابِ تقابل در خود ندیدہ با تحائف و نفائس بسیار خود را بملازمت

رسانید، سلطان فرمود چرا خود را زبون کردی، راجہ در جواب گفت کہ اہلِ کرام خدمت و تواضعِ مہمان موجبِ افتخار و ترقیِ مقتبایہ خود دیدہ اند[1]

یعنی سنگرام راجہ نے جب اپنے اندر سلطان محمود کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ پائی تو وہ تحفے اور قیمتی چیزیں لے کر بادشاہ کے پاس آیا، سلطان محمود نے کہا یہ تکلیف کیوں کی؟ تو راجہ نے اس کے جواب میں کہا کہ باعزت لوگ مہمان کی خدمت اور تواضع کرنا اپنے لیے موجبِ فخر و ترقی خیال کرتے ہیں.... سلطان محمود راجہ کی اس بات سے خوش ہوا اور وہ کشمیر سے واپس چلا گیا وغیرہ وغیرہ مگر ان باتوں میں افسانوی رنگ پیدا ہوگیا ہے،

محمود کی ایسی ہی ایک مہم کا ذکر مشہور فارسی شاعر فرخی سیستانی کے اشعار میں بھی پایا جاتا ہے، یہ چند اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں!

مجلس بلب جوئے برائے شمۂ خوبان ۔۔۔ کز گل چو بنا گوشِ تو گشتہ است رہِ جوئے

از مجلسِ ما روم در روے بر دکن ۔۔۔ پیش آدمی سرخ و فرو کہن گل دو روئے

تا روزِ بشادی بگزاریم کہ فردا ۔۔۔ وقت رہِ غزو آمد و ہنگامِ تگاپوئے

گاہ است کہ یکبار بکشمیر خرامیم ۔۔۔ از دستِ بتان بینہ کنیم از سرِ بت گوئے

بس شہر کہ مردانش با ما چخیدند ۔۔۔ کامروز نہ بینند درا و جز زنِ بے شوئے

سلطان محمود کو کشمیر کے اندرونی حالات سے باخبر کرنے اور دیگر معلومات بہم پہونچانے والا ایک واقف کار شخص دربار میں موجود تھا، اس کا نام تلک تھا، تلک ایک حجام زادہ تھا، مگر علمی

---

[1] تاریخ حسن: مولوی غلام حسن کھویہامی ج ۲ ص ۱۵ محکمہ تحقیقات و نشریات سرینگر

[2] تاریخ دیالمہ و غزنویان: عباس پرویز، مطبوعاتی علی اکبر علمی، ایران: ص ۲۵۵۔

تربیت کشمیر میں حاصل کی تھی، ابوالفضل دبیر بیہقی جس نے تلک کے اوصاف بیان کرنے میں کئی صفحات سیاہ کئے ہیں، لکھتے ہیں :-

این تلک پسر حجامے بود ولیکن لقائی	یہ تلک ایک حجام کا بیٹا تھا، لیکن
ومشاہدتی وزبانِ فصیح داشت'	خوب صورت' اور فصیح البیان تھا،
وخطی نیکو بہ ہندی وفارسی، مدتی	ہندی اور فارسی میں اس کا خط
دراز بکشمیر رفتہ بود وشاگردی کرد	عمدہ تھا، کافی وقت کشمیر میں گزارا
..... واز آنجا قاضی شیراز ابوالحسن	اور وہیں تعلیم بھی حاصل کی، پھر یہاں
آمد و بگر دیدہ۔	سے شیراز کے قاضی ابوالحسن کے پاس آیا اور اسی کا ہو رہا،

تلک نے ضرور محمود کو کشمیر کے اندرونی حالات وواقعات سے باخبر کیا ہوگا، تاریخ بیہقی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تلک محمود غزنوی کا خاص آدمی تھا، سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۲ء میں ویہند کے راجہ جے پال کو شکست دی، جے پال نے اپنے آپ کو زندہ جلایا، اس کے بعد اس کا بیٹا انند پال تخت نشین ہوا، انند پال نے کچھ وقت تک محمود کے ساتھ تعلقات ٹھیک رکھنے کو ترجیح دی، جس کی وجہ سے ہندوستان کے دوسرے راجہ انند پال سے بدظن ہوئے لیکن جب انند پال کو محمود کے خلاف صف آرا ہونے کے لئے مطلع صاف نظر آیا تو نہ صرف خود میدان میں کود پڑا بلکہ دوسرے راجاؤں سے بھی مدد کی درخواست کی، ان راجاؤں نے اپنی سابقہ رنجشیں ایک طرف رکھتے ہوئے اور ہندوستان کی روحِ قومیت کی بقا کے لئے انند پال کے ہاتھ مضبوط کئے، اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے حکمرانوں نے اپنے عظیم الشان فوجی دستے بھیج دیئے، جو پنجاب میں اکٹھے ہوئے، مگر بالآخر یہ متحدہ کوشش بھی ناکام رہی، اور ۱۰۰۸ء میں انند پال نے محمود کے ہاتھوں شکست فاش کھائی، انند پال بھاگا

لہ تاریخ بیہقی: ابوالفضل بن حسین، دبیر بیہقی: تصحیح دکتر غنی ودکتر فیاض چاپخانہ ملی طہران

اور کشمیر کے پہاڑوں میں جا چھپا۔[1]

انند پال کی اس شکست کے چند سال بعد اس کا بیٹا ترلوکن پال اپنی بچی کھچی سلطنت کا مالک ووالی بنا، وہ سست ہونے کی بنا پر محمود سے ٹکر نہ لینے کا ارادہ رکھتا تھا، اس لئے اس کے بیٹے بھیم پال نے امورِ مملکت اپنے ہاتھوں میں لے، بھیم پال نے محمود کا مقابلہ کرنے کے لئے کشمیر کے معاصر راجہ سنگرامہ راجہ" (عہدِ حکومت ۱۰۰۳ء تا ۱۰۲۰ء) سے مدد کی درخواست کی سنگرام راجہ نے یہ درخواست منظور کرلی، اور بھیم پال کی مدد کے لئے فوج کی ایک بڑی تعداد تنگ کی کمانداری میں روانہ کی، محمود کو پہلے بھیم پال کی فوج کے ساتھ ایک وادی میں جو جہلم کے راستے سے کشمیر سے ملتی تھی، مقابلہ کرنا پڑا، کشمیری کمانڈر تنگ نے پہلے پہلے محمود کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا مگر اس نے اپنی کامیابی سے دھوکا کھا کر مزید آگے بڑھنے کی کوشش کی، اب محمود بذاتِ خود اپنی فوج کے ساتھ دشمن کی طرف بڑھا، بھیم پال نے تنگ کو ایک چٹان کے پیچھے چھپنے کا مشورہ دیا، مگر وہ اس کا مشورہ درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے محمود کا مقابلہ کرنے کے لئے اور آگے بڑھا، محمود نے اسے شکست دی اور فرار ہونے پر مجبور کیا، بھیم پال نے حالات کو قابو میں لانے کی کوشش کی، مگر محمود نے اسے بھی شکست دی اور آگے کشمیر کی طرف بڑھا، کشمیر کی طرف رخ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ یہاں کے اطراف ومضافات پر بھی قابض ہو گیا، ابوسعید گردیزی کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں، ان سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت پر روشنی پڑتی ہے،

وامیر محمود فرمان داد تا آن قلعہا کہ	سلطان محمود نے حکم دیا کہ درۂ کشمیر کے
اندراں درۂ کشمیر بود ویگر فتند وغارت	تمام قلعے برباد کر دیئے جائیں جو قبضے میں
کردند، ولشکر ازاں قلعہا بسیار	لائے گئے ہیں، فوج نے ان قلعوں سے

لہ الکامل فی التاریخ: عزالدین ابن اثیر ج ۹، ص ۱۸۶، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۶ء سے پروفیسر محمد حبیب: ص ۳۷۔

غنائم بردہ یافت، و بسیار کافران باسلام آمدند، و اندریں سال فرمودند ہر جائیگہ کشادہ بود از دیار کفار مسجد ہائے جامع ساختند و استادان را فرمود تا بہر جائے بفرستادند، تا مر ہندوان را شرائط اسلام بیاموختند و خود باظفر و فیروزی سوئے غزنین آمد و ایں فتح نندنہ اندر سنہ خمس و اربع مایۃ بود[1]

کافی مال غنیمت حاصل کیا، اور بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان بنایا، اسی سال سلطان نے یہ بھی کہا کہ جو جگہ غیر مسلموں سے خالی ہو جائے، وہاں مسجدیں تعمیر کی جائیں اور علماء و مبلغین کو حکم دیا کہ وہ ہر جگہ جائیں اور غیر مسلموں کو اسلامی شرائط و حدود سکھائیں، خود سلطان کامیابی کے ساتھ غزنین لوٹا، نندنہ کی یہ فتح ۴۰۵ھ میں واقع ہوئی۔

محمود نے ترلوچن سمیت بھیم پال کو شکست دی، اور اس کے بعد اس دشمن کی طرف رخ کیا جس نے ان کو محمود کے خلاف کمک پہونچائی تھی، یہ دشمن کشمیر کا بادشاہ تھا، بلکہ کشمیر اور کشمیر کے حکمران ان مفرور حکمرانوں کے لئے ملجا اور ماوی بنے ہوئے تھے، جو سلطان محمود کے دشمن اور حریف مقابل تھے، کشمیر کو محمود ابتداء شروع سے اپنے تصرف اور قبضے میں لانے کا آرزومند تھا، مگر اب کشمیری حکمرانوں کی دشمنی نے محمود کو کشمیر کی طرف بڑھنے کے لئے معقول وجہ فراہم کی، سنگرام راجہ اس وقت کشمیر کا فرمانروا تھا، محمود ۱۰۱۵ء میں کشمیر کی طرف بڑھا، اس نے توسہ میدان کی راہ سے قلب وادی میں داخل ہونے کی کوشش کی، مگر یہاں اس کا راستہ ایک مضبوط اور مستحکم قلعہ کی وجہ سے رک گیا، اور محمود نے قلعہ پار کرنے کے لئے پوری طاقت صرف کی، پھر بھی ناکام ہوا، اس نے ایک مہینے تک قلعے کا محاصرہ کیا، اسی دوران

[1] زین الاخبار، ابو سعید عبد الحی بن الضحاک گردیزی، ترتیب و تعلیق: عبد الحی حبیبی، انتشارات بنیاد فرہنگ، ایران: ص ۱۸۱۔

موسم بھی بدل گیا، برف باری اور جاڑے کی شدت سے محمود اور اس کی فوج کو سخت پریشانی اٹھانی پڑی، مورخ ابو سعید گردیزی لکھتا ہے:۔

سرمائے سخت اندر آمد و برف آمدن گرفت و جہان یخ بستہ شد و از راہ کوہہائے کشمیر مرآن اہل حصار مدد رسید از کشمیر قوت یافتند، چون امیر محمود رحمۃ اللہ بر آن حملہ بدید اندیشہ کرد کہ نباید کہ بہ سپاہ وے خللی رود و از ان قلعہ بازگشت و بصحرا بیرون آمد از ان کوہ دریا، چون وقت بہار آمد بغزنین باز آمد[1]

سخت سردی شروع ہوئی، برف باری سے دنیا یخ بستہ ہوئی، اہل کشمیر کی طرف سے پہاڑوں کی جانب سے قلعہ بند لوگوں کو خوراک اور دیگر قسم کی مدد ملتی تھی، جب سلطان محمود نے یہ سب کچھ دیکھا تو اسے اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی فوج کوئی غلط حرکت کرنے پر آمادہ ہو جائے، اس لئے وہ فوراً قلعہ سے واپس اور پہاڑوں اور دروں سے نکل کر میدان کی طرف آیا، جب موسم بدل گیا تو غزنین کی طرف مراجعت کی۔

اس طرح محمود کو محاصرہ سے دست بردار ہونا پڑا، ابو القاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ واپسی پر محمود کی فوج راستے میں کھو گئی، بہت سے فوجی ہلاک ہوئے، کہتے ہیں کہ محمود کو ساری ہندوستانی مہموں میں جس مہم سے سب سے زیادہ شدائد و حوادث پیش آئے وہ یہی کشمیر کی مہم تھی[2]، اس مہم کے پورے پانچ سال بعد محمود نے ۱۰۲۱ء میں ستمبر اور اکتوبر کے وسط میں کشمیر کی طرف پھر رخ کیا، مگر اس مرتبہ بھی اس کا مقصد پورا نہ ہوا، ایک مہینے تک قلعے کا محاصرہ کیا، موسم سرما پھر شروع ہوا، برف باری ہونے لگی، اور محمود محاصرہ اٹھا کر غزنین لوٹنے پر مجبور ہوا، ان حملوں کے دوران محمود کو وادی

[1] زین الاخبار: ص ۱۸۱، ۱۸۲ [2] تاریخ فرشتہ (اردو) حیدر آباد ۱۹۲۶ء: ج ۱ ص ۸۰۔

نے محمود کے حملۂ کشمیر پر (H.C. Ray) میں داخل ہونے کا کوئی موقع نہیں ملا، مسٹر رائے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمود اگرچہ وادی میں داخل ہونے میں ناکام ہوا، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جنوب کی طرف سے کشمیر کے بلند پہاڑوں کا ایک حصہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا[1]۔ پروفیسر رائے نے اپنی رائے کی تائید میں ایک معاصر مؤرخ عتبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ۱۰۱۸ء میں محمود نے قنوج پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو کشمیر کے ایک درہ کے حاکم نے اس کی ہمرکابی اور رہنمائی کی[2]، اس حکمران کا نام جنکی بن شاہی تھا، علامہ ابن خلدون نے بھی "فتح کشمیر و قنوج" کی سرخی کے تحت یہی بات لکھی ہے۔

ثم اعتزم علی غزو الہند سنۃ	پھر سلطان محمود کو ۴۰۹ھ میں ہند پر حملہ
تسع واربع مائۃ وقد کان	کرنے کا شوق لاحق ہوا، جبکہ اس نے
دوّخ بلادھا کلھا ولم یبق علیہ	ہند کے تمام ممالک کو روند ڈالا تھا اور
الا کشمیر ومن دونھا الفیافی	اب کشمیر کے علاوہ کوئی ملک باقی نہ رہا تھا،
والمصاعب فاستنفر الناس	کشمیر کے درمیان جنگلات اور دشوار گذار
من جمیع الجہات من المرتزقۃ	راستے حائل تھے، اس نے تمام علاقوں کے
والمتطوعۃ وبث عساکرھم فی	لوگوں سے کمک حاصل کی، محمود نے وادیوں
اودیۃ لا یعبر عن شدتھا	میں فوج بچھا دی [illegible]
جریھا وبعد اعماقھا	کی وجہ سے ناقابل عبور تھیں اور کشمیر پہونچ گیا
وانتھی الی کشمیر و	اس وقت میں یہاں کے حکمران محمود کی خدمت میں
کان ملوک الہند فی	اطاعت نامہ بھیجتے تھے، کشمیر کا راجہ

Dynastic History of Northern India [illegible]

تلک الممالک تبعث الیہ بالخدمۃ	جنکی بن شاہی دیا ہی، بھی آیا، اس نے
والطاعۃ وجاءہ صاحب درب	بھی اطاعت قبول کی، مزید برآں اس نے
کشمیر وھو جنکی بن شاھی (اٰی	سلطان اور اس کی فوج کی رہنمائی کا کام
سھی) فاقر بالطاعۃ وضمن	بھی اپنے ذمہ لے لیا، انھیں محفوظ قلعے
دلالۃ الطریق وسار امام	کی جانب پہونچایا، اس طرح اس نے
العسکر الی حصن المامون	سلطان کے لشکر کی پیشوائی کی، یہ بیس
لعشرین من رجب[1]	رجب کا واقعہ ہے۔

مؤرخ عتبی اور علامہ ابن خلدون دونوں نے درۂ کشمیر کے راجہ کا نام جنکی بن شاہی دیاہی، لکھا ہے، جبکہ رینالڈ نے عتبی کے ترجمہ میں سبلی بن شاہی بن بھی اور پروفیسر محمد حبیب نے سالی لکھا ہے[2]، غرض اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ کشمیر میں اسلام کو متعارف کرنے میں محمود غزنوی کا بھی حصہ رہا ہے، اس کے حملوں کے نتیجے میں آس پاس کے بہت سے علاقے اسلام سے متاثر ہوئے، عباس پرویز لکھتے ہیں کہ کشمیر کی آس پاس کی گھاٹیوں اور دروں کے حکمرانوں اور رؤسا نے سلطان محمود کی بڑی آؤ بھگت کی تھی، سلطان کی خدمت میں تحفے اور نذرانے پیش کئے تھے اور بندگی و فرمانبرداری کا اظہار کیا تھا[3]۔

محمود غزنوی کے اخلاف محمود کے بعد اس کے حکمران ورثا نے بھی کشمیر پر کئی بار قسمت آزمائی کی، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت پر روشنی ڈالتے ہوئے

---

[1] کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر: علامہ ابن خلدون، قسم اول، مجلد چہارم: ص ۹۶،
دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۸ء - [2] "Mahmood of Gaznin": P136
[3] تاریخ دیالمہ و غزنویاں: ص ۲۵۶ -

فرشتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلطان محمود کی وفات کے تین سال بعد سنہ ۴۲۲ھ میں سلطان مسعود غزنوی نے کشمیر پر ایک مرتبہ اور حملہ کیا، اور اہلِ شہر قلعہ بند ہو گئے[1]، عباس پرویز بھی یہی بات لکھتے ہیں:-

سلطان مسعود در سال سنہ ۴۲۲ھ
باسپاہیانِ عظیم بکشمیر رفت و قلعۂ
سرستی را تسخیر کرد و غنائمِ بسیار بدست
آورد و بغزنین مراجعت کرد[2]

سلطان مسعود نے سنہ ۴۲۲ھ میں ایک بڑے
لشکر کے ساتھ کشمیر کی طرف رخ کیا، اور قلعۂ
سرستی پر قبضہ جمایا، وافر مالِ غنیمت حاصل
کرکے اس نے غزنین کی طرف مراجعت کی۔

سلطان مسعود کے بعد سلطان مودود نے بھی کشمیر کی طرف رخ کیا، اس نے ۴۴۴ھ مطابق ۱۰۴۴ء میں اپنے بیٹے ابوالقاسم محمود کو لاہور کا حاکم اور ابو علی کو ہند کا سپہ سالار بنا کر بھیجا جس نے پشاور، کشمیر اور ملتان کی بغاوتیں فرو کیں[3]۔

غزنوی سلاطین کے بعد جب سلطان محمد شہاب الدین غوری نے تسخیرِ ہند کا ارادہ کیا تو اس نے کشمیر کی جانب کوئی توجہ نہ کی، اس کے بعد آنے والے دوسرے سلاطین کا بھی یہی حال رہا، انھوں نے دور دور تک ہندوستان کے اطراف تہ و بالا کئے، مگر کشمیر کی طرف نہیں بڑھے، شاید اس کی وجہ وہ پرخطر رکاوٹیں تھیں، جو پہاڑ، قلعے اور دریاؤں اور ویرانوں کی صورت میں جگہ جگہ حائل تھیں، اور جن کی وجہ سے بڑے بڑے مہم جو سلاطین کو بھی نا امیدی کی حالت میں واپس ہونا پڑا تھا، سلطان علاؤ الدین خلجی (۱۲۹۳ء تا ۱۳۱۶ء) کی فوج ایک طرف جنوبی ہند کی انتہا تک پہونچی، اور دوسری طرف حدود کشمیر سے لے کر میسور تک اس کی سلطنت کے

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات: علامہ سید سلیمان ندوی: ص ۴۰۱، الہ آباد ہندوستانی اکیڈمی سنہ ۱۹۳۰ء

[2] تاریخ دیالمہ و غزنویان ص ۳۳۵ [3] عہد اسلامی کا ہندوستان ص ۹۳۔

حدود پھیلے، مگر باین جلال و جبروت اس نے بھی کشمیر کی طرف بڑھنے سے گریز ہی کیا،

مغلوں نے کئی بار کشمیر پر حملے کئے، سب سے پہلے چنگیز نے اپنے جنرل سوبے تائے بہادر (Subotai Bahadur) کو حکم دیا کہ وہ گیارہ قبائل پر حملہ کرے، ان میں ایک کشمیر بھی تھا، اوگتائی خاں نے اپنے کمانڈر کو کشمیر کی سرحدوں کی طرف بھیجا تھا، منگو خاں اور زنگو دار خاں دونوں نے اپنے کمانڈروں کو تسخیرِ کشمیر کے لئے روانہ کیا تھا[1]، مگر ان حملوں میں سب سے زیادہ کامیاب حملہ ذوالجو کا حملہ تھا، حملہ آوروں نے یہاں وہی کیا، جو وسط ایشیا میں ان کے اسلاف نے کیا تھا،

سنہ ۷۲۴ھ میں ہلاکو خاں کی اولاد میں سے ایک شخص ذوالجو (یا ذوالقدر خاں) نے اپنی فوج کے ساتھ کشمیر کے دشت و جبل پار کرکے وادی میں قدم رکھا، اس زمانے میں کشمیر کا حکمراں تھا، اور یہ زمانہ کشمیر کے انحطاط کا تھا، سہ دیو اور اس کی فوج میں وہ طاقت و جرأت نہ تھی کہ مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے فرودی تھی، اس لئے اس نے راہِ فرار اختیار کرکے کشتواڑ میں پناہ لی، پھر وحشی مغلوں کو جو کچھ کرنا تھا کسی مزاحمت کے بغیر کیا، مولوی غلام حسن رقمطراز ہیں:-

ذوالقدر خاں صمصام خون آشام
از نیام برکشیدہ ساکنان اینجا را از خواص
و عوام قتلِ عام نمود و نسواں
و طفلان در دستِ تاجرانِ
ترکستان کہ ہمراہِ خود آوردہ بود
بیع کردہ خزینہ باندوده

ذوالقدر خاں نے اپنی خون آشام تلوار
نیام سے کھینچ لی، کوئی امتیاز برتنے کے بغیر یہاں
کے خواص و عوام کا قتل کیا، عورتوں اور
بچوں کو ترکستانی تاجروں کے ہاتھوں بیچ
دیا، وہ ان تاجروں کو اپنے ساتھ لے
آیا تھا، اس نے یہاں خزینے اکٹھا کئے، یہاں

---

[1] Prof. S. N. Koul's Introduction To Touaraja's Rajtaraugmi : P 44.

مال و متاع و دواب و حیوان از	کے مال و دولت، حیوانات، مویشی
ہر کس بغارت بردہ، عمارات شہر را	کو غارت کر کے لوٹا اور شہر کو نذر آتش
آتش کشیدہ با خاک یکساں ساخت[1]	کر کے مٹی میں ملا دیا۔

رشید الدین فضل اللہ (م ۱۳۱۹ء) تقریباً اسی دور میں گذرا ہے، اور مغل سلاطین کے ساتھ بڑا قریبی تعلق رکھتا تھا، اس کو کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل تھے، وہ بھی کشمیر نہیں آیا، مگر اس کو باوثوق ذرائع سے معلومات حاصل ہوتے رہے،

وہ رامدیو کے عہد میں مغلوں کی یورش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے،

وبعہد رامہ دیو سائب جیش	[illegible]	رامہ دیو کے عہد میں قاآن کے حکم سے
المغول بحکم قاآن العادل و کان[2]		مغل فوج نے کشمیر کی طرف رخ کیا، فوج
مقدمہم اوکتو فحاصروا		نے کشمیر کا محاصرہ کر کے یہاں کے
بلدۃ کشمیر و قتلوا اہلہا و		لوگوں کو قتل کیا، اور جو کچھ اموال و اسباب
نہبوا الاموال التی کانت فیہا[3]		یہاں موجود تھا وہ لوٹ لیا، اوکتو خان

اس غارت گری کے بعد جب مغل واپس لوٹے تو ابھی کچھ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ وہ پھر کشمیر پر حملہ آور ہوئے، اور اس مرتبہ بھی (بالفاظ رشید الدین فضل اللہ)

حاصروا کشمیر و ملوکہا	[illegible]	کشمیر کا محاصرہ کر کے اپنے قبضہ تصرف
و قتلوا الکبائر واستاسروا الصغار[3]		میں لایا، یہاں کے بزرگوں کو قتل کیا

ہندو دور حکومت میں اسلامی اثرات | غرض مغل کشمیر کے در و دیوار پھاند کر وادی میں داخل ہو گئے، ان کے ساتھ مسلمانوں کی کثیر تعداد بھی ہوا کرتی تھی، مزید برآں اس سیلاب نے دوسرے ممالک کے صوفیوں، تاجروں اور سیاحوں کو کشمیر میں داخل ہونے کیلئے

---

[1] تاریخ حسن جلد ۲ ص ۱۶۳، [2] تاریخ الہند، مصنفہ رشید الدین فضل اللہ تذکرہ کشمیر، [3] ایضاً،

اچھا موقع فراہم کیا،

ہمیں واضح طور پر اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ آس پاس کے اسلامی ممالک کے ساتھ کشمیر کے سفارتی تعلقات تھے یا نہیں، مگر اتنا تو بہر حال صحیح ہے کہ کشمیر کے حکمرانوں کے اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے، گجرات کے ایک راجہ مول راج سولنکی (۹۴۲ تا ۹۷۶ء) کے ہاں ایک بار ایک تقریب ہوئی تو مہمانوں میں کشمیر کا بھی ایک سفیر موجود تھا جو کشمیر کے راجہ کی طرف سے مشک بطور تحفہ لایا تھا،[1] سلطان محمد تغلق دوسرے ممالک بالخصوص اسلامی مملکتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں مشہور تھا، اگرچہ اس کے اور کشمیر کے حکمرانوں کے ساتھ کسی قسم کے تعلق ہونے یا نہ ہونے کا ذکر نہیں ملتا ہے، تاہم یہ ثابت ہے کہ کشمیر کے داخلی حالات سے سلطان باخبر تھا، اس نے اپنے زمانے کے مشہور عالم شیخ شمس الدین یحییٰ کو کشمیر میں اسلام پھیلانے کے لئے حکم بھی دیا تھا، جو شیخ کے اچانک انتقال کی وجہ سے ممکن نہ ہو سکا، عرب ممالک اور کشمیر کے حکمرانوں کے تعلقات پر کہیں سے روشنی نہیں پڑتی ہے،

برامکہ اور کشمیر | ہارون الرشید اور مامون کا عہد، خلافت عباسیہ کے عروج و اقبال کا دور تھا، یاقوت الحموی برمکیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ خلافت بغداد کا مشہور و معروف وزیر یحییٰ برمکی کا دادا کشمیر میں طویل عرصے تک قیام پزیر تھا، اور اس نے کشمیر ہی میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، یاقوت لکھتا ہے،

برمک ابو خالد فاتم ستۂ	برمک (جو خالد کا باپ تھا) کی ماں اپنے
ھربت بہ و کان صغیراً الیٰ	بیٹے برمک کو لیکر کشمیر کی طرف بھاگ گئی، برمک

---

[1] تاریخ گجرات: پروفیسر ابو ظفر ندوی، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۸ء: ص ۱۴۹

وبقشمیر من بلاد الهند فتىً نشأ	اس وقت چھوٹا تھا، اس نے کشمیر ہی میں
هناک و تعلم علم الطب	نشوونما پائی، اور طب، نجوم اور فلسفہ
والنجوم وانواعاً من الحکمة[1]	کے مختلف فنون کی یہاں تحصیل کی۔

برمک کی ماں فارس سے بھاگ کر کشمیر آئی، برمک کی اولاد بعد میں مسلمان ہوئی، جن میں خالد نامور ہوا، خالد کا مشہور روزگار بیٹا یحییٰ تھا، جو ہارون الرشید کا وزیر اعظم تھا، عرب و ہند کے باہمی تعلقات میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے باعث بڑی حد تک برمکی ثابت ہوئے، ان ہی کی تحریک سے سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے ہندوستان سے اہل علم بلائے گئے اور بے شمار کتابیں مختلف زبانوں سے عربی میں منتقل ہوئیں[2]، ہند سے طلب کئے جانے والے علماء میں کیا کوئی کشمیری عالم بھی تھا، اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ہے، البتہ اوپر کے اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ برمکیوں کے کشمیر کے ساتھ گہرے تعلقات تھے، برمک کی ماں کا فارس سے بھاگ کر کشمیر آنا کسی معقول مصلحت ہی کی بنا پر رہا ہوگا۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ برامکہ اصل میں بدھ تھے، نہ کہ مجوسی، برمک کی ماں کا کشمیر وارد ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ کشمیر بھی اس زمانے میں بدھ مت کا عظیم الشان مرکز اور بدھ مت کے علوم کا گہوارہ تھا، غرض کشمیر کا انتخاب خواہ مخواہ اور بے وجہ نہ تھا بلکہ سوچ سمجھ اور جان بوجھ کر کشمیر میں پناہ لی گئی تھی، بلکہ پروفیسر ندوی یہاں تک لکھتے ہیں کہ برمکی خاندان نسلاً کشمیری تھا[3]۔

[1] معجم البلدان: ج۰۷، ص ۳۲۲ زیر عنوان "نوبہار" [2] عہد اسلامی کا ہندوستان ص ۳۹

[3] تاریخ سندھ: ص ۱۴۰ (حاشیہ)

مسلمان تجار اور سیاح تجارت کے سلسلہ میں بیرونی ممالک کے باشندے کم یا زیادہ تعداد میں کشمیر وارد ہوا کرتے تھے، راہ داری اور پہرہ داری کے باوجود سیاح، تاجر اور اہل علم وادی میں آیا جایا کرتے تھے، کشمیر کے جغرافیہ اس کی صنعت و حرفت اور اس کی خاص تہذیب و ثقافت غیر ملکی لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتی تھی، آج سے ہزاروں سال پہلے بھی کشمیر اسی طرح مشہور تھا جس طرح آج ہے، ابن خرداذبہ (م ۳۰۰ھ) نے آج سے گیارہ سو سال پہلے لکھا ہے،

ومن مدن الهند المشهورة	ہندوستان کے مشہور شہروں میں
سابل وهودین و قندهار	سابل، ہودین، قندھار اور کشمیر
و قشمیر[1]	قابل ذکر ہیں۔

ان تاجروں میں یقیناً مسلمان تجار بھی ہوتے ہوں گے، پہلے بھی گذر چکا ہے کہ للتادت (معاصر محمد بن قاسم کے جانشین) وزرادت یا وجرادت کے بارے میں کشمیر کا قدیم مورخ کلہن لکھتا ہے کہ اس نے بہت سے کشمیریوں کو ملیچھوں کے ہاتھوں فروخت کیا[2]، اس کی تائید عرب تاریخوں سے بھی ہوتی ہے، یاقوت حموی لکھتا ہے،

فهم احسن خلق الله خلقة	کشمیر کے لوگ مخلوقات میں نہایت خوبصورت
بنسائهم المثل لهن قامات	ہیں، ان کی عورتیں اپنی خوبصورتی میں
تامة وصورة سوية	ضرب المثل ہیں جو دراز قد، سڈول

[1] المسالک والممالک: ابو القاسم عبید اللہ المعروف بہ ابن خرداذبہ (متوفی فی حدود ۳۰۰ھ) مطبوعہ لیڈن ۱۸۸۹ء: ص ۶۸۔

[2] Kashmir under The Sultans P 234.

وشعورهم على غاية السباطة　یکساں صورت ہیں، ان کے سر کے بال

والطول والضخامة تباع الجارية　ہموار، گاڑھے اور لمبے ہیں یہاں کی

منها بمائتي دينار واكثر.[1]　لونڈیاں دو سو دینار (اشرفی) بلکہ اس

سے بھی زیادہ قیمت میں بیچی جاتی ہیں۔

قزوینی نے بھی اهلها الطف الناس صباحة وحسنا لکھا ہے۔[2] اسی طرح کشمیری شال آج سے سیکڑوں سال پہلے بھی بہت سے ممالک میں شہرت رکھتی تھی بیرونی ممالک کے تاجر شال اور دیگر قسم کی چیزیں خریدنے کے لئے کشمیر آیا کرتے تھے، کچھ بعید نہیں کہ ان تاجروں کی بدولت بھی کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی ہو، اور اس سے مبلغین کے لئے راستہ ہموار ہوا ہو، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے تاریخ فرشتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی وفات کے تین سال بعد ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا، اور اہل کشمیر قلعہ بند ہوئے، اس وقت یہاں مسلمان تاجر تھے، وہ بھی قلعہ بند ہو گئے۔[3] اسی طرح سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں دہلی میں کشمیری شالیں پائی گئیں، خود سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک کشمیری شال تھی۔[4] بعض اہل کشمیر کو اس پر احساس فخر ہے کہ پولس کی محبوبہ کے پاس ایک کشمیری شال تھی، مگر حضرت سلطان المشائخ کے پاس کشمیری شال ہونا اس سے زیادہ اہم ہے۔

---

[1] معجم البلدان ج ۹ ص ۴۹، عنوان: کشمیر [2] آثار البلاد واخبار العباد: زکریا بن محمد بن محمود القزوینی، بیروت ۱۹۶۰ء: ص ۴۰۲ [3] عرب و ہند کے تعلقات، ص ۳۰۱ [4] Studies in Midieval Indian History and culture. By Prof. Khaliq Ahmad Nizami: P. 4

مسلمان سیاح کشمیر، پہاڑوں اور جنگلوں سے محیط ہونے کے باوجود غیر ملکی سیاحوں، سفیروں، مسافروں، طالب علموں وغیرہ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا ہے، عربی تاریخوں میں ایک عرب سیاح کا نام ملتا ہے، جو سید شرف الدین عبد الرحمن سے چار سو سال قبل کشمیر وارد ہوا تھا، یہ مشہور عرب سیاح مسعر بن مہلہل ینبوعی تھا، جس کا انتقال ۳۳۱ھ میں ہوا ہے، اس نے اپنے کمیاب بلکہ نایاب سفرنامے میں کشمیر کے بارے میں جو مختصر معلومات درج کئے ہیں، ان کی تائید آج بھی ہوتی ہے، موصوف کے اس سفرنامے سے بہت سے عرب مورخوں نے استفادہ کیا ہے، ان میں صفی الدین عبد المؤمن[1]، زکریا قزوینی، یاقوت حموی اور ابن ندیم قابل ذکر ہیں، بلکہ ابن ندیم اس سے بالمشافہ ملا ہے، اور معلومات حاصل کئے ہیں۔[2]

مسعر بن مہلہل ابودلف مسعر بن مہلہل (م ۳۳۱ھ / ۹۴۲ء) ینبوع کا رہنے والا تھا، جو بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے، مسعر عرب کا مشہور سیاح گذرا ہے، اس نے دنیا کے ایک بڑے حصے کی سیاحت کی ہے، خود فخر کے ساتھ کہتا ہے،

فنحن الناس كل الناس　في البر و في البحر

اخذنا جزية الخلق　من الصين الى مصر

الى طنجة بل في كل　ارض خيلنا تسرى

اذا ضاق بنا قطر　نزل عنه الى قطر

لنا الدنيا بما فيها　من الاسلام والكفر

فنصطاف على الثلج　ونشتى بلد التمر

---

[1] مراصد الاطلاع على اسماء الامكنة والبقاع: صفی الدین عبد المؤمن بن عبد الحق البغدادی (م ۷۳۹ھ) احیاء الکتب العربیۃ، مصر ۱۹۵۵ء ج ۲ ص ۹۴۰ [2] ملاحظہ ہو الفہرست

مسعر عربی شاعری کا بھی ذوق رکھتا تھا، مسعر نے خراسان کا سفر کیا، اور یہاں اہل ساسان کے ہاں تقرب حاصل کیا، اس نے اہل ساسان کی تعریف و توصیف میں ایک طویل عربی قصیدہ بھی کہا ہے، جو القصیدۃ الساسانیۃ سے مشہور ہے، مندرجہ بالا اشعار اسی قصیدے سے ماخوذ ہیں، ثعالبی نے یہ قصیدہ اپنی کتاب میں من و عن نقل کیا ہے اور مسعر کے کچھ حالات بھی بیان کئے ہیں[1]، قصیدے کا مطلع یہ ہے،

جفون دمعها تجری — لطول الصد والهجر

مسعر خراسان سے چین وارد ہوا، اور چین سے تبت پہونچا، آگے تبت سے کشمیر میں داخل ہوا، تبت سے کشمیر کا سفر پیدل طے کیا، اس نے اپنا سفرنامہ عجائب البلاد کے نام سے لکھا ہے، اس کے نسخے نہایت کمیاب ہیں، جرمنی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے، کشمیر کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا اقتباس یاقوت الحموی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے[2] ہم یہ اقتباس درج کرتے ہیں؛

خرجنا من جاجلی الی مدینة	ہم جاجلی سے نکل کر ایک شہر کی طرف آئے
یقال لها قشمیر کبیرة عظیمة	جس کا نام کشمیر ہے، یہ بہت ہی بڑا ملک
لها سور وخنادق محکمات	ہے جس میں مضبوط شہر پناہ اور خندقیں ہیں
وملکها اکبر من ملک کله والتم	یہاں کا حکمراں پورے ملک کا سب سے
طاعة ولهم اعیاد فی دؤس	بڑا حکمراں ہے، جس کی اطاعت مکمل
الاهلة	طور پر کی جاتی ہے، یہاں کے لوگوں

[1] یتیمة الدهر فی محاسن اهل العصر: ابو منصور عبد الملک الثعالبی النیسابوری (م ۴۲۹ھ) مطبع حجازی قاہرہ ج ۳ ص ۳۵۴

ولهم رصد کبیر فی بیت معمول	کے تہوار ہلال ظاہر ہونے پر منائے
من الحدید الصینی لا یعمل فیه	جاتے ہیں، یہاں ایک رصدگاہ بھی ہے
الزمان ویعظمون الثریا	جو چینی لوہے سے بنی ہوئی ایک عمارت میں ہے،
ویاکلون المالح من السمک	مگر عرصہ سے اس میں کام نہیں ہوتا، یہاں کے
ولا یاکلون البیض ولا یذبحون	باشندے ثریا تاروں کی تعظیم بھی کرتے ہیں
قال وسرت منها الی کابل	مچھلیاں کھاتے ہیں مگر انڈے نہیں کھاتے
	اور نہ جانوروں کو ذبح کرتے ہیں پھر
	میں یہاں سے کابل کی جانب روانہ ہوا[1]

مسعر کا بیان بالکل صاف ہے، تاہم چند باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے،

اول مسعر جس راستے سے کشمیر میں داخل ہوا، اس نے اس کا نام جاجلی بیان کیا ہے اور یہ وہی پہاڑی راستہ ہے جو زوجیلا کے نام سے مشہور و معروف ہے، جغرافیہ کشمیر میں یہ جگہ "Zojila" یا "Soji - La" اور بل تل کوتال "Baltal-Kotal" یا دراس گھاٹی کے مختلف ناموں سے موسوم ہے[2]، قدیم زمانہ میں کشمیر میں داخل ہونے کے لئے یہ راستہ تین اہم ترین راستوں میں سے ایک تھا،

ثانیاً مسعر نے جس چینی لوہے کی بنی ہوئی رصدگاہ یا جن مضبوط دیواروں کا تذکرہ کیا ہے، ممکن ہے یہ وہی چیز ہو جس کا قدیم کشمیری مورخ کلہن نے بھی ذکر کیا ہے، یعنی

[1] معجم البلدان ج ۹ ص ۹۴ -

[2] Gazeteer of Kasmir and Ladakh Vivekat Publishing House 1974 "Zojla"

پہرہ داری اور ناکہ بندی کے وہ مقامات جو کشمیر کی سرحدوں پر ہوتے تھے، اور جہاں غیر ملکی باشندوں کو روکا جاتا تھا، اور پوری تحقیق کے بعد انہیں وادی میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی تھی، ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں اس کا ذکر کیا ہے، آگے ہم المسعودی کا بیان بھی درج کرتے ہیں، اس سے بھی اس زمانے میں کشمیر کی سرحدی حفاظت اور کڑی نگرانی کی توثیق ہوتی ہے، سر آرل سٹائن نے اس موضوع پر مفصل اور دلچسپ معلومات فراہم کیے ہیں[1] تا تا انڈوں اور گوشت سے اجتناب آج بھی کشمیر کے راسخ العقیدہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے، اور اس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے،

معجم البلدان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک اور عرب سیاح بھی کشمیر میں داخل ہوا ہے، اس کا نام کتاب میں مذکور نہیں ہے، البتہ یاقوت نے صرف ایک شعر نقل کیا ہے جس میں وہ فخر کے ساتھ اپنی سیر و سیاحت کا ذکر کرتا ہے، مگر راقم کے نزدیک اس شعر سے مسعر بن مہلہل ہی کی بو آتی ہے۔

وجولت الهنود وارض بلخ　　وقشمير وادتني الكميت[2]

علاوہ ازیں ہم کو ان بہت سے سیاحوں سے صرف نظر کرنا چاہیے، جو اگرچہ کشمیر کی وادی میں داخل نہیں ہوئے ہیں مگر اس کے حدود تک پہونچے ہیں، اور وہ کشمیر کے بارے میں صحیح معلومات رکھتے تھے، ان میں المسعودی اور البیرونی کے نام خاص طور پر

---

[1] The Ancient Geography of Kashmir Sir A. Stein. Published in JASB vol LXVIII Part I 168

[2] معجم البلدان ج ۹ ص ۹۴ -

لیے جا سکتے ہیں، صرف ابن بطوطہ نے کشمیر کے حالات بیان کرنے میں مکمل خاموشی اختیار کی ہے، البیرونی سلطان محمود غزنوی کی تسخیر کشمیر کی مہم میں موجود تھا، اس نے کشمیر میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے، اپنی کتاب "تحقیق ما للہند" میں کشمیر کی صرف علمی حالت بیان کی اور بڑے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ کشمیر اور وارانسی ہندوستان کے دو بے مثال علمی مرکز ہیں، وہ لکھتا ہے کہ وید زمانہ قریب تک منتشر حالت میں تھے، اور ان کی حفاظت کا دار و مدار پنڈتوں کی قوت حافظہ پر تھا، مگر ایک کشمیری عالم ہی سب سے پہلے اس کی جمع و تدوین کر کے ضبط تحریر میں لایا وغیرہ۔ اس کتاب میں کشمیر پر ایک مستقل باب وقف ہے،

المسعودیؒ ابو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی (م ۳۴۶ھ) اپنے وقت کا بڑا عالم اور جہاں دیدہ سیاح تھا، وہ مسعر بن مہلہل کا معاصر تھا، مگر وادی میں داخل نہ ہو سکا بلکہ اس کے حدود سے گذرا تھا، اس نے کشمیر کے جغرافیہ کے بارے میں مختصر معلومات درج کئے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ کشمیر کا بادشاہ رائے (راجہ) سے معروف ہے، یہ ملک بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، لوگوں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ان پر چڑھ سکیں، اڑنے والے جانوروں کو چھوڑ کر دوسرے انواع کے وحشی جانور بھی ان پہاڑوں کی بلندیوں تک نہیں پہونچ سکتے، جہاں تک اندرون ملک وادی کا تعلق ہے تو اس میں وادیاں، درخت، چشمے اور تیز رفتار نہریں ہیں، یہ جگہ عجائب عالم میں سے ہے، یہاں بادشاہ کے حکم سے پہرہ لگا رہتا ہے،

لا سبيل لاحد من الناس على　　غیر ملکیوں میں سے کسی کو اجازت نہیں ہے کہ
ذلك الا من وجه واحد ويغلق　　وہ یہاں داخل ہو جائے، صرف ایک راستہ
على جميع ما ذكرناه[1] -　　اس کے لیے مخصوص ہے، باقی دوسرے راستے بند رہتے ہیں۔ (باقی)

---

[1] مروج الذهب ومعادن الجوهر: المسعودی، مطبعة البهية مصر ۱۳۴۶ھ : ج ۱ ص ۱۰۳

قاضی حمید الدین بلخی

اور

اُن کا صحیح نام

از

جناب رضیہ خاتون وحید منزل علی گڑھ

حمید الدین بلخی (م ۵۵۹ھ) کی شخصیت فارسی ادب میں اہم ہے، ان کی مشہور کتاب "مقاماتِ حمیدی" ہے جو چھٹی صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی ہے[1]۔ اس کتاب سے دنیائے ادب میں مقامہ نویسی کے اعتبار سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ انوری نے اپنے ایک قطعہ[2] میں اس کی اس طرح تعریف کی ہے۔

[1] مقاماتِ حمیدی عربی کی دو کتابیں یعنی مقامات بدیع الزماں ہمدانی اور مقاماتِ حریری کی تقلید میں لکھی گئی ہے، اللہ خاتمہ میں اس کی تاریخ [illegible] نظامی عروضی کے چہار مقالہ لکھی ہے، لیکن فرحنی نے اس کتاب کا ذکر ان کتابوں میں کیا ہے جو اصحاب فضل کو پڑھنا چاہئے، اس سے ظاہر ہے کہ مقاماتِ حمیدی چہار مقالہ سے کچھ پہلے [illegible] اس کتاب میں المستنجد کی خلافت کا ذکر ہے، جو ۵۵۵ھ میں شروع ہوئی ہے، اس سے واضح ہے کہ [illegible] حمید الدین نے اس میں بعد میں بھی اضافے کئے ہیں، عوفی کے علاوہ سعد الدین وراوینی نے مرزبان نامہ کے مقدمہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ [2] دیوان انوری، طبع سعید نفیسی ص ۳۳۵۔

ہر سخن کآں نیست قرآں یا حدیثِ مصطفیٰ — از مقاماتِ حمید الدین شد اکنوں ترہات

اشکِ اعمیٰ داں مقاماتِ حریری و بدیع — پیشِ آں دریائے مالا مال از آبِ حیات

شاد باش اے عنصر محمودیاں را [illegible] تو — رو کہ تو محمود عصری ما بتانِ سومنات

از مقاماتِ تو گر فصلی بخوانم بر عدد — حالی از نا منطقی حذر اصم یابد نجات

عقلِ کل خطی تامل کردہ گفت اے عجب — کم اکسیرِ سخن داند مگر قاضی القضاۃ

دیرہاں ای رای و قدرت عالمِ توحید را — آفتابی بی زوال و آسمانی باثبات

قاضی حمید الدین اپنے زمانے میں بلخ کے قاضی القضاۃ تھے، فارسی کا مشہور شاعر انوری ان کا معاصر تھا، کسی شاعر نے اپنی ایک نظم میں بلخ کی ہجو کی تھی، یہ "ہجوِ بلخ" انوری کے حاسدوں میں سے کسی نے انوری کی طرف منسوب کر دی، جس سے اس کے خلاف وہاں بڑی شورش ہوئی، اس سلسلے میں انوری نے جن لوگوں سے مدد طلب کی ان میں سے ایک شخص مجد الدین ابوالحسن عمرانی تھے[1] اور دوسرے قاضی حمید بلخی، ان کی مدح میں انوری نے ایک مشہور قصیدہ کہا ہے، جس کے چند شعر قابلِ ذکر ہیں[2]۔

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری — وز نفاقِ تیر و قصدِ ماہ و کیدِ مشتری

اس قصیدے میں اس نے اپنی برات کا اظہار کیا ہے[3]۔

چہار شہر است خراساں را بہ چہار طرف — کہ وسطِ شاں بمسافت کم صد در صد نیست

گرچہ معمور و خراب‌اش ہمہ مردم دارد — نہ چنانست کہ آبستنِ دیو و دد نیست

بلخ را عیب اگر چند بہ او باش کنند — بہ ہر حال بخیرِ دی نیست کہ صد بخردی نیست

[1] ابوالحسن عمرانی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کا مطلع ہے:-

اکنوں کہ ماہِ روزہ بنقصان در افتاد — آوازِ حجابِ حجرۂ دل پردہ در افتاد

ص ۸۰ دیوانِ انوری [2] دیوانِ انوری ص ۳۰۱ [3] دیوانِ انوری ص ۳۵۹

مصر جامع را بچارہ نبود از بد نیک — معدن زر دو گہر بی سرب و ابید نیست

مردمش ہر یست بترتیب و ہمہ چیز درو — حد و ہنرش متساوی و ہری ہم بد نیست

حبذا شہر نشابور کہ در ملک خدای — گر بہشت است ہمینست و گرنہ خود نیست

قاضی حمید الدین کے نام کے سلسلے میں اختلاف ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ ان کا نام حمید الدین ابوبکر بن عمر بن محمود تھا، محمود عوفی نے لباب الالباب میں یہی لکھا ہے، چنانچہ بعد کے مصنفین نے اسی کی پیروی کی ہے، یہی نام سعید نے تعلیقات دیباچۂ دیوان انوری[1] میں لکھا ہے۔ مرحوم بہار نے سبک شناسی[2] میں بھی اسی کی تائید کی ہے۔ مجمع الفصحا طبع مصفا[3] میں اور رہنمائے ادبیات فارسی[4] میں ان کا نام قاضی حمید الدین عمر بن محمود البلخی ہی ملتا ہے۔

سب سے پہلے علامہ محمود قزوینی نے اس نام کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا، تعلیقات چہار مقالہ[5] میں وہ لکھتے ہیں۔

"عمر اسم پدر او ابوبکر کنیۂ او بودہ و حاجی خلیفہ ہم فقط و کنیۂ او الحقنا کردہ است و گویا حق با حاجی خلیفہ باشد۔"

لیکن علامہ محمود قزوینی کے اس واضح شک کے باوجود کسی نے ان کا صحیح نام معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی، ورنہ بعد کے مصنفین کو ان کا نام عمر لکھنے میں تکلف ہوتا، علامہ محمود قزوینی کے نزدیک یہ ان کے باپ کا نام تھا۔

حال ہی میں ایک کتاب بنام فضائل بلخ[6] سامنے آئی ہے، اس کے مؤلف شیخ فصیح الدین ابوبکر

۱؎ دیوان انوری ص ۳۵۹ ۲؎ سبک شناسی جلد ۲ ص ۳۲۹ ۳؎ مجمع الفصحا جلد ۱ ص ۳۲۹ ۴؎ رہنمائے ادبیات فارسی ص ۲۶۶ ۵؎ ص ۲۳ ۶؎ فضائل بلخ۔ یہ کتاب استاد عبد الحی حبیبی کی تصحیح سے بنیاد فرہنگ کی طرف سے ۱۳۵۰ شمسی میں شائع ہو چکی ہے۔

واعظ بلخی ہیں، یہ بلخ کے علماء کا تذکرہ ہے۔ اس کی تالیف ۶۱۰ھ میں ہوئی، یہ عربی میں تھی، لیکن عربی کتاب کے کسی نسخہ کا پتہ نہیں، البتہ اس کا ایک فارسی ترجمہ ۶۷۶ھ میں بلخ ہی میں عبد اللہ محمد حسینی نے کیا تھا وہ مل گیا ہے، اس میں ان کا نام حمید الدین محمود لکھا ہے اور ان کے والد کا نام بہاء الدین عمر درج کیا ہے۔ فضائل بلخ[1] سے معلوم ہوا کہ قاضی القضاۃ حسن محمودی کے تین بھائی تھے، محمود سب سے بڑے تھے، اس کے بعد قاضی القضاۃ حسن محمودی اور قاضی القضاۃ بہاء الدین عمر محمودی تھے، پہلے دو بھائیوں کی وفات ۵۰۶ھ میں ہوئی ہے اور تیسرے بھائی کی ۵۳۶ھ میں، یہ بلخ کے قاضیوں کا بڑا خاندان تھا، انہی تیسرے بھائی یعنی بہاء الدین عمر کے بیٹے صاحب مقامات تھے، فضائل بلخ کے الفاظ یہ ہیں[2]

"اما برادر سوئم ایشان، قاضی القضاۃ بہاء الملۃ والدین المسمیٰ عمر، در سنہ ست و ثلاثین و خمسمایہ، قاضی بلخ را تقلد کردہ و مر ورا پسری عالم فاضل کامل حمید الدین محمود بودہ است، او در کلام شہرتی تمام داشتہ است در اقلیم عالم و در نہایت عقل و کمال فضل بود، بالنظم المغرب الحسن، والنثر الکامل، و کتاب مقامات و کتاب روضۃ الرضا، و رسایل متفرقۂ او دلیل است بر فصاحت و بلاغت وے۔"

اس بیان سے واضح ہے کہ حمید الدین محمود ہی ہیں، جن کی کتاب مقامات حمیدی ادب فارسی میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

قاضی حمید الدین دراصل عربی کے بڑے عالم تھے، ان کی بیشتر کتابیں عربی میں ہیں، ان کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر فضائل بلخ میں ہے، عوفی[3] نے چند اور تصانیف کا ذکر کیا ہے، جو یقیناً عربی میں تھیں، لیکن اب ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں، قاضی صاحب کی تمام شہرت کا مدار ان کی یہی فارسی کتاب مقامات حمیدی ہے، فضائل سے

۱؎ فضائل بلخ ص ۲۴۳-۲۴۵ ۲؎ فضائل بلخ ص ۲۴۴ ۳؎ عوفی لباب الالباب جلد ۱ ص ۱۹۹

مزید یہ بات معلوم ہوئی کہ ان کا خاندان محمودی کہلاتا تھا، جو ان کے اجداد کے نام سے منسوب ہے، ان کے محمودی ہونے کی تائید انوری کی بیت[1] سے بھی ہوتی ہے۔

شادباش ای عنصر محمودیان را روح تو   رو کہ تو محمود عصری بتان سومنات

اس سے ظاہر ہے کہ ان کا نام حمید الدین ابوبکر محمود بن عمر بلخی ہے۔ ان کے نام کے سلسلے میں غلطی لباب الالباب میں محمد عوفی سے ہوئی تھی، جس میں ان کا نام عمر بن محمود درج ہے، وہی بعد کے مصنفین کے یہاں نقل ہوتی رہی، لیکن حاجی خلیفہ[2] نے عوفی کی روایت کے خلاف ان کا نام اس طرح درج کیا ہے، حمید الدین ابوبکر عمر بن محمود، اور ابن اثیر کے یہاں بھی ان کا نام ابوبکر کی کنیت کے ساتھ درج ہوا ہے۔ لیکن فضائل بلخ کے واضح بیان کے بعد یہ صاف ہو جاتا ہے کہ قاضی حمید الدین کا پورا نام قاضی حمید الدین ابوبکر محمود بن عمر تھا اور جب تک کوئی دوسری سند نہ ملے اس وقت تک اسی کو صحیح سمجھنا چاہئے اور عام طور پر جو یہ مشہور ہے کہ ان کا نام عمر تھا غلط سمجھنا چاہئے۔

[1] دیوان انوری ص ۳۳۵ [2] کشف الظنون ص ۱۷۸۶

شعر العجم حصۂ چہارم

اس حصہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن و معاشرت اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا اور کیا تغیرات پیدا کئے، اور فارسی شاعری کی صنف مثنوی خصوصاً فردوسی کے شاہنامہ پر بسیط تبصرہ،

از:- مولانا شبلی نعمانی

قیمت:- ۱۲ روپے،

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ
مطبوعات جدیدہ

مرقومات امدادیہ - بڑی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۷۰، مجلد مع گردپوش، قیمت پندرہ روپے، پتہ مکتبہ برہان اردو بازار دہلی۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکیؒ کا روحانی فیض پورے ہندوستان میں جاری ہے، ان کی ظاہری تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی، مگر باطنی کمالات میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ علمائے کبار بھی ان کے سامنے ناصیہ فرسا رہے، زیرِ نظر کتاب حاجی صاحب کے ان ۵۱ مکتوبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے گیارہ خلفا و مریدین کو تحریر کئے تھے، ان میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حاجی عابد حسینؒ اور حکیم ضیاء الدین رامپوریؒ جیسے اصحاب کمال خلفا شامل ہیں، اکثر خطوط کی زبان فارسی ہے، ان میں تصوف و سلوک کے حقائق و معارف بھی ہیں، اور بعض اشخاص کے نام اور واقعات کا ذکر بھی آگیا ہے، جن کو وضاحت کے بغیر سمجھنا مشکل تھا، اس لئے حضرت کے ایک مرید باصفا اور اس صدی کے جامع کمالات شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے صوفیانہ مباحث کی تفہیم کے لئے خود حواشی قلمبند کئے، اشخاص و واقعات کی توضیح مولانا سعید الدین رامپوری سے کرائی، اور مولانا عبد الحئی سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ کرایا، یہ سب خطوط مع ترجمہ و تحشیہ پہلی دفعہ ۱۹۲۹ء میں چھپے تھے، مگر

اب یہ مجموعہ کمیاب تھا، اس لئے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی استاذ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے اس کو اپنے چالیس صفحوں کے مقدمہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے، مقدمہ محنت اور دلچسپی سے لکھا گیا ہے، اس میں حاجی صاحب کے مختصر حالات و باطنی کمالات کے علاوہ ان کی بیعت کے سلسلہ کے بعض غلط واقعات و روایات کی تصحیح بھی کی گئی ہے، مقدمہ نگار کے بقول "یہ مجموعہ متوسلین سلسلۂ چشتیہ صابریہ امدادیہ کے لئے خصوصاً اور تصوفِ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے عموماً ایک نعمت غیر مترقبہ ہے" لیکن طباعت کا اہتمام اور مکاتیب کی ترتیب جس سلیقہ سے کی جانی چاہئے تھی نہیں کی گئی ہے آخر میں کئی صفحے فہرستوں اور انڈکس کے ہیں۔

تاریخِ ادب عربی

مرتبہ و تلخیص ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۶، قیمت تین روپئے، پتہ ایوان کمپنی، نخاس کہنہ، الہ آباد۔

تاریخ الادب العربی مشہور مصری فاضل احمد حسن زیات کی مقبول کتاب ہے جو اپنے مباحث و مشمولات کے علاوہ ترتیب و تالیف اور انداز بیان و طرز ادا وغیرہ کے اعتبار سے بھی اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے، اس کی یہ خوبی بھی ہے کہ نہ زیادہ طویل ہے اور نہ بہت مختصر، عرصہ ہوا مولانا عبد الرحمن طاہر سورتی نے اس کا اردو ترجمہ پاکستان سے شائع کیا تھا، مگر وہ ہندوستان والوں کی دسترس سے باہر ہے اور آج کل طلبہ کے لئے وقت کی کمی اور وسیع تعلیمی اشتغال کی بنا پر اس متوسط کتاب سے استفادہ کرنا آسان نہیں ہے، اس لئے اس کتاب کا متن اور پاکستانی ترجمہ دونوں کو پیش نظر رکھ کر یہ تلخیص شائع کی گئی ہے، اس میں کتاب کے تمام مباحث آگئے ہیں لیکن شوقی، حافظ اور زہاوی وغیرہ کے بعد کی ادبی تاریخ اور عربی ادیبوں کے ذکر سے یہ خالی ہے، کتاب کی جامعیت کے خیال سے اس جلد میں اس کا بھی مختصر خاکہ شامل کر دینا چاہئے تھا۔

فن کار سے فن تک

از جناب ابوذر عثمانی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۳۰ روپئے۔

پتے (۱) تاج بک ڈپو مین روڈ، رانچی، (۲) بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ۔

جناب ابوذر عثمانی لکچرر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی کے ادبی و تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں چھپتے رہے ہیں، اب انھوں نے ان کا پہلا مجموعہ شائع کیا ہے جو چودہ مضامین پر مشتمل ہے، ان میں قابل ذکر یہ ہیں، (۱) غالب کی ناقدانہ بصیرت (۲) اکبر اور مسئلۂ زبان (۳) اختر اورینوی کا اسلوب (۴) تدریس ادب کے جدید تقاضے اور اردو نصاب (۵) ادبی تنقید کی تدریس کا مسئلہ (۶) بہار میں اردو تنقید کے ابتدائی کارنامے (۷) جدید شاعری میں اظہار و بیان کا پہلو (۸) عملی تنقید کیا ہے؟ پہلے مضمون میں غالب کی سخن فہمی اور ناقدانہ بصیرت پر اچھے انداز سے بحث کی گئی ہے، دوسرے میں اکبر کی زبان اور رسم الخط کے مسائل اور جھگڑوں نیز ان کے حل کی ان صورتوں کا ذکر ہے جن کو اکبر نے اپنی شاعری میں اپنے خاص طرز و انداز میں بیان کیا ہے، اختر اورینوی کے اسلوب کی خصوصیات کے ضمن میں ان کے وسیع علم و مشاہدہ، رنگین تخیل اور لطیف احساس وغیرہ کا بھی ذکر ہے، اردو ادب کے درس و تدریس، اس کے نصاب کی اصلاح اور اس کی نئی تشکیل کی ضرورت پر مفید اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے، ادبی تنقید کے سلسلہ میں اساتذہ و طلبہ کو زریں مشورے دیئے گئے ہیں اور ان دونوں موضوعات پر اچھی اور بہتر کتابوں کی ترتیب و تالیف کی ضرورت بھی واضح کی ہے، جدید شاعری سے متعلق مضمون میں اس کی روایات کو اردو شاعری کی وسعت کی دلیل بتایا گیا ہے، آخری مضمون میں عملی تنقید کا مفہوم، اس کے حدود، دائرۂ کار اور فائدے تحریر کئے ہیں اور اس پر اعتراضات کا جواب دیا ہے لیکن اس مضمون کے بعض خیالات میں ابہام ہے، اردو انشائیہ سے متعلق مضمون کے بعض خیالات بھی واضح نہیں ہیں، اختر اورینوی کے اسلوب کا

بلکہ صرف افسانوں کی حد تک مخصوص ہے اس میں تنقیدی و ادبی تحریروں کے اسلوب کی خصوصیات نہیں دکھائی گئی ہیں مجموعی حیثیت سے یہ مضامین اردو زبان و ادب کے طلبہ کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں مگر قیمت بہت زیادہ ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ اسماعیل شہید مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی، چھوٹی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۶۴، قیمت درج نہیں، پتہ الفرقان بکڈپو ۳۱ نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ

یہ رسالہ حضرت شاہ اسماعیل شہید کے حالات علمی، دینی اور اصلاحی خدمات کا مختصر مرقع ہے، لائق مصنف نے شاہ صاحب کی مشہور و مقبول کتاب تقویۃ الایمان کے تعارف کے ضمن میں اس پر بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے اور ان لوگوں کے خیال کی مدلل تردید کی ہے جن کو اس کے شاہ صاحب کی تصنیف ہونے میں شک و شبہ ہے، مصنف کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ تقویۃ الایمان پر اعتراضات سے اس کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا، یہ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود مفید اور لائق مطالعہ ہے،

انتخاب :- از جناب سکندر علی وجد صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت نہایت عمدہ صفحات [illegible] مجلد قیمت [illegible] روپئے، ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر نئی دلی،

جناب سکندر علی وجد اس دور کے بہت ممتاز شاعر ہیں، ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان سب پر معارف میں مفصل تبصرہ بھی کیا جا چکا ہے، اب انجمن ترقی اردو نے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، جن لوگوں کو ان کے پچھلے مجموعے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے انکے لئے یہ انتخاب نعمت غیر مترقبہ ہے، وجد صاحب کو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت ہے اور انکے یہاں دونوں کے بہترین نمونے موجود ہیں یہ انتخاب [illegible] تک کی مشہور و مقبول نظموں و غزلوں پر مشتمل ہے گویا اس میں پچھلے سب مجموعوں کا عطر آگیا ہے،

امید کہ یہ انتخاب مقبول ہوگا، اور وجد صاحب کے قدرداں اس کو شوق سے پڑھیں گے،

"ض"

مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات مرتبہ نظر برنی، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۴، قیمت ۲۰ روپیے، پتہ، ادبی سنگم، جامعہ نگر، نئی دہلی [illegible]

رئیس الاحرار مولانا محمد علی ہندوستانی سیاست کے ایک اہم ستون، ہندوستان کی تحریک آزادی کے بہت بڑے مجاہد، تحریک خلافت کی روح رواں، ترک موالات کے علمبردار، اور اسلام کے ایک عظیم سپاہی تھے۔ ان کی شخصیت میں بڑی رنگارنگی تھی، بڑے اچھے مقرر، شاعر اور صحافی بھی تھے حصول آزادی کی خاطر انہوں نے دیار غیر میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی، لیکن آزادی کے بعد ان کو فراموش کر دیا گیا تھا،

جولائی [illegible] میں ادبی سنگم کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی صدارت میں "مولانا محمد علی، شخصیت اور خدمات" کے عنوان سے ایک سمپوزیم منعقد ہوا تھا، بعد میں ادبی سنگم کے منتظم نظر برنی صاحب نے اس سمپوزیم کے مقالات اور تقریروں کو شائع کرنا چاہا تو دوسرے اہل قلم کو بھی اس موضوع پر لکھنے کی ترغیب دی پھر کچھ پرانے مضامین کو بھی مختلف کتابوں سے جمع کیے اور اب ان سب کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، اس طرح مولانا عبد الماجد دریابادی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عابد حسین، عبد اللطیف بجنوری، قاضی عبد المجید زبیری، ضیاء الدین برنی اور اسرار بصری کی تحریریں بھی اس میں آگئی ہیں، یہ سب تاثراتی مضامین ہیں، جن میں مولانا کی شخصیت، علم و فضل، ذہانت، شرافت، عظمت، سیاسی بصیرت، اور ملک و ملت کی قیادت اور دوسری نمایاں خصوصیتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، خان نیازی کا ٹلی نے مولانا کے کردار، انسانی

ہمدردی و دلسوزی، جذبۂ اخلاص اور وطن دوستی پر اپنے تاثرات اچھے انداز میں پیش کئے ہیں، محمد حسین عثمانی نے ایک وطن دوست کے عنوان سے مختصر مگر جامع مضمون تحریر کیا ہے، نور الرحمن اور ابراہیم فکری نے مولانا کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے، جن سے ان کی زندگی اور شاعری کے مختلف ادوار سامنے آجاتے ہیں، سب سے طویل اور قیمتی مضمون سید حامد صاحب کا "مولانا محمد علی کی شخصیت ادبی غیر ادبی" کے عنوان سے ہے، اس میں مولانا محمد علی کی نامور معاصرین کے مقابلہ میں انکی عظمت و برتری دکھائی ہے، انڈین نیشنل کانگریس اور گول میز کانفرنس میں مولانا کی تقریریں بھی شامل کر دی گئی ہیں، جن سے ان کی سیاسی بصیرت کے علاوہ ان کی قوت ایمانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، آخر میں ببلیوگرافی کے عنوان سے نظر برنی اور مہ لقا ملکہ صاحبہ نے مولانا پر لکھے گئے مضامین اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو بہت تشنہ ہے، مولانا عبد اللہ کا ایک عربی مرثیہ اردو ترجمہ کے ساتھ بھی درج ہے، کتاب میں، کتابت و طباعت کی بعض خامیاں بھی ہیں، ص۱۵۳ پر کرۂ ارض سے محسوس کے بجائے محو ہونا چاہئے، ص۱۶۷ پر اسراف کا املا اصراف ہے عدم اعتدال کے بجائے بے اعتدالی لکھنا چاہئے، ازلی کا املا اذلی لکھا ہے، ص۱۹۲ پر آرایش و پیرائش کے بجائے آرائش و زیبایش ہونا چاہئے، ص۱۹۲ پر گویا کہ کے بجائے گو کہ لکھنا تھا، ص۱۹۶ پر سفری اور پیادہ رو نثر جیسے الفاظ سے مفہوم واضح نہیں ہوتا، ص۲۲۱ پر فائز المرامی کو فائز المرامی لکھا ہے، ارادہ تقسیم کرنا نہیں ارادہ فسخ کرنا لکھنا چاہئے، اسی صفحہ پر مرثیہ عربی کے بجائے رثاء العربیہ ہونا تھا، ص۱۶۱ پر اسرار بصری نام درج ہے جب کہ یہ رمزی نام ہے، اور صحیح نام شورش کاشمیری لکھنا تھا۔ ان خامیوں کے باوجود یہ مجموعۂ مضامین مولانا کے فضل و کمال، ذہانت، عبقریت، فراست و تدبر، ادبی، علمی، سیاسی اور دینی عظمت، متنوع و ہمہ گیر شخصیت کا ایک اچھا مرقع ہے۔

م - ن

جلد ۱۲۵ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۵

مضامین

دار المصنفین کی ادبی خدمات

دار المصنفین جیسے عظیم علمی و دینی ادارہ کی ادبی خدمات پر ایک سیر حاصل اور پر از معلومات مقالہ جس پر فاضل مقالہ نگار کو بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے اس میں اس ادارہ کی اس وقت تک کی مجمل تاریخ بھی آگئی ہے، از ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی، قیمت ۷۰ روپئے

منیجر